اقبالؒ کے عرفانی زاویے

اقبالؒ کے عرفانی زاویے

مجموعۂ مضامین

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

القمر انٹرپرائزز
غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور

خوبصورت، معیاری کتابیں



القمر انٹرپرائزز
اہتمام: محمد سعید اللہ صدیقی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

طبع : اول 2001ء
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
قیمت پاکستان میں : 180 روپے
غیر ممالک میں : 10 امریکی ڈالر

اِنتساب

والد گرامی

جنّت مکانی خلد آشیانی مرحوم و مغفور

سید سبط نبی عابدی منصفؔ (ریٹائیرڈ جج)

کی محبّتوں کے نام جو میرے لئے اقبالؔ شناسی

کے پہلے اور آخری معلّم تھے۔

دانم نرسد ذرّہ بہ خورشید و لیکن

شوق طیراں می کشد ارباب ہمم را

(عرفیؔ شیرازی)

فہرست

(۱) علامہ اقبالؔ کی دعا	3
(۲) اقبالؔ مفسّر قرآن (سورۂ اخلاص کی تفسیر)	7
(۳) علامہ اقبالؔ کی نعتیہ شاعری	15
(۴) علامہ اقبالؔ فنافی الرسولؐ تھے	21
(۵) علامہ اقبالؔ اور زیارتِ رسولؐ	26
(۶) بوصیری اور اقبالؔ (قصیدہ بردہ شریف)	29
(۷) اقبالؔ اور عشق حضرت علیؑ	33
(۸) اقبالؔ عاشق امام حسینؑ	39
(۹) منقبت حضرت فاطمہؑ ۔ (اقبالؔ کی قلبی واردات)	43
(۱۰) اقبالؔ کا تصوّر زمان و مکان	48
(۱۱) علامہ اقبالؔ کا شاہین	53
(۱۲) علامہ اقبالؔ کا ابتدائی کلام	63
(۱۳) علامہ اقبالؔ اور حسن نظامی کی قلمی جنگ	67
(۱۴) علامہ اقبالؔ اور اکبر الہ آبادی	74
(۱۵) علامہ اقبالؔ اور مہاراجہ کشن پرشاد	80

(۱۶) علامہ اقبالؔ اور حیدرآباد دکن 84
(۱۷) علامہ اقبالؔ کی ازدواجی زندگی 88
(۱۸) علامہ اقبالؔ پر تہمت شراب نوشی 92
(۱۹) علامہ اقبالؔ اور آفتاب اقبال 100
(۲۰) اقبالؔ کیسے علامہ سے سر ہو گئے 105
(۲۱) معلّم اقبالؔ شمس العلما میر حسن 109
(۲۲) علامہ اقبالؔ مشاہیر عالم کی نگاہ میں 112
(۲۳) علامہ اقبالؔ اور ٹیپو سلطان شہید 118
(۲۴) علامہ اقبالؔ اور ڈاکٹر راس مسعود 127
(۲۵) سپاس جناب امیرؑ 133
(۲۶) علامہ اقبالؔ اور مسئلہ فلسطین 138
(۲۷) مولانا گرامیؔ اور علامہ اقبالؔ 145
(۲۸) مولانا ندوی سے علامہ اقبالؔ نے کیا دریافت کیا؟ 149
(۲۹) کیا داغؔ دہلوی کے سوا علامہ کسی کے شاگرد رہے؟ 153
(۳۰) مولانا گرامیؔ علامہ کے استاد کیوں نہیں؟ 157
(۳۱) خلاصہ مطالب مثنوی در تفسیر سورۂ اخلاص (فارسی) 171

نسخۂ دیانت

علامہ اقبالؔ (۱۸۷۷ء ۔ ۱۹۳۸) بیسویں صدی کے عظیم ترین مفکر اور فلسفی شاعر تھے اور میری نظر میں بیسویں صدی اقبالؔ کی صدی کہلائے گی۔ ان کا نثری اور شعری کلام اخلاقی اور روحانی اقدار پر مبنی ایک ایسے فلسفۂ حیات کا حامل ہے جس نے تمام عالم انسانیت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس حکیمانہ کلام کا تقاضہ ہے کہ گاہے گاہے اِسے ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسے رمز شناس اور نکتہ سنج محقق میسّر آتے رہیں جو اپنے ذوقِ سلیم اور اپنی مخلصانہ کاوشوں کو بروئے کار لا کر فکر و فلسفہ کے اس بحرِ بیکراں سے گراں مایہ موتی چُن کر نذرِ قارئین کرتے رہیں۔ زیرِ نظر نسخہ " اقبالؔ کے عرفانی اور فکری زاویوں کا مجموعہ " ایک ایسا ہی تحفہ ہے۔ اس کی تخلیق میں ڈاکٹر عابدی صاحب نے جس ادبی دیانت داری، محققانہ صلاحیت اور مطالعاتی گہرائی کا مظاہرہ کیا ہے وہ نہایت ہی قابلِ تحسین و ستائش ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دلدادگانِ اقبالؔ اور اقبالیات کے طلبہ کے ساتھ ساتھ دنیائے اُردو ادب کے اہلِ نظر حضرات بھی اس مجموعہ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

حضرت علامہ کی شخصیت اور اُن کے کلام کے بارے میں بہت کچھ تحریر ہونے کے باوجود ابھی بہت کچھ تحریر کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ باقیات اقبالؔ کے معیار اور ضخامت دیکھ کر احساس ہوتا ہے کی علامہ موصوف نے اپنے کلام کی تشہیر اور اشاعت میں جس احتیاط اور مصلحت کوشی سے کام لیا اُس سے اُن کی ذات کے کئی احسن پہلو عوام الناس سے پنہاں رہے۔ اس میں وقت کی سیاسیات مذہبی رجحانات اور دیگر عناصر کا عمل دخل کتنا تھا یہ تو قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور کا انگریز نواز اور پنڈت نواز ماحول اس فرزندِ اسلام کو کیسے برداشت کرتا جس کی نگاہ میں ایک سحرِ تازہ کا نقشہ جگمگا رہا تھا اور جو ایک نئے زمانے کی طلوع کے خواب دیکھ رہا تھا۔

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اُٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب (مسجد قرطبہ)

بقول حضرت فرمان فتحپوری ''اقبالؔ سب کے لئے '' اقبالؔ کو بیشتر کتابوں میں اب تک جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ اقبالؔ کے مطالعہ کی راہیں ہموار کرنے کی بجائے مغالطے پیدا کرتا ہے۔ بہت سے مصنفین نے اقبالؔ کے حقیقی افکار سے گریز کر کے اور اپنے متعصبانہ نقطہ نظر کے تابع ہو کر پیام اقبالؔ کو ایسا پُوں پُوں کا مربّہ بنا دیا ہے کہ اس کا مطالعہ نہ صرف اقبالیات کے طلبہ کے لئے بلکہ اہلِ نقد ونظر کیلئے بھی ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے''۔

اِن حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ موجودہ نسل بلکہ آئندہ نسلوں کو از سر نو کلام و پیام اقبالؔ سے بلا تعصب متعارف کروایا جائے۔ اس کلام کی ہمہ گیریت اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے کج فہم کم ظرف اور کوتاہ اندیش ناقدین کی آراء کے چُنگل سے آزاد کر کے عوام الناس تک بلا گزند پہنچایا جائے۔ اس کام کیلئے ادبی دیانت داری، اقبالؔ شناسی اور مخلصانہ محنت کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں اس بات کا احساس وقت گزر جانے کے بعد ہوا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اقبالؔ کا یہ شعر ہم ہر صادق آجائے۔

؎ اب میری شہرت کی سوجھی ہے! کوئی دیکھے انہیں
مٹ کے میں جس دم غُبار کوئے رسوائی ہوا (باقیات اقبالؔ)

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی یہ تخلیق اِس ضمن میں ایک ایسا ہی احسن اقدام ہے۔ گو یہ مجموعہ کسی جامعیت یا حتمیت کا دعویٰ نہیں کرتا نہ ہی یہ اس بار کا متحمل ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے قارئین یقیناً مستفیض بھی ہوں گے اور اُن کے اقبالؔ شناسی کے اشتیاق میں اضافہ بھی ہوگا۔

علامہ اقبالؔ کی شخصیت اوران کے فکروفن کے بارے میں تحریری مواد کے بطور مطالعہ اوراس کے تحقیقی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں علامہ کے بارے میں قیاس آرائیاں اور غلط فہمیاں خطرناک حد تک موجود پائی جاتی ہیں اس کا ازالہ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کہیں ایک موضوع پر علامہ کے خیالات یا اُن کی رائے معلوم کرنا مقصود ہوتو یہ مواد یکجا میسّر نہیں آتا۔ اگر کچھ مل بھی جائے تو وہ بغیر تصدیق اور بغیر حوالہ جات ہوتا ہے جسے آج کا سائینسی ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ اس میدان پر پورا اترنے کیلئے لازم ہے کہ محقق نہایت احتیاط، محنت، بھرپور مطالعہ اور چھان بین کے بعد کوئی رائے پیش کرے اور اس ضمن میں کسی بھی معلوماتی عنصر کو نظر انداز نہ کرے۔ یہ اقبالؔ شناسی کا تقاضا ہے۔ اقبالؔ خود ہر فن میں کمال کے داعی تھے۔

انساں کو فکر چاہیئے ہر دم کمال کی
کسبِ کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

ڈاکٹر تقی عابدی نے اُسی کمال کی جُستجو میں اپنا قلم اٹھایا ہے اور اُسی ادبی ذہانت اور مخلصانہ کاوش کا مظاہرہ کیا ہے جس کی ضرورت تھی۔ علامہ کی شخصیت کے جن پہلوؤں کو اس مجموعہ میں زیر بحث لایا گیا ہے اُن کیلئے دلائل اور تحریری ثبوت فراہم کرنا ایسی دستاویزات کا متقاضی تھا جو قدرے ناپید ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت ذمہ داری سے ان لوازمات کو نبھایا ہے جس کیلئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بابائے ضرافت جناب ضمیر جعفری مرحوم جنہوں نے ڈاکٹر عابدی کو ''نیویارک کے جمیل جالبی'' کا خطاب دیا تھا اگر آج حیات ہوتے اور ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ کے معمول کو دیکھتے تو وہ انہیں '' کتابی کیڑا '' نہیں '' کتابی مگرمچھ '' کہتے۔ وہ اس لئے کہ ورق گردانی اور کُتب خوانی میں جو سبک رفتاری انہوں نے دکھائی ہے ہوخیرہ کردینے والی بات ہے کہ اس برق رفتار ماحول اور پیشہ طب کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اتنا کچھ اتنے کم وقت میں کر دکھایا۔ دبستانِ اُردو سے ہزارہا میل دور نیوفاؤنڈ لینڈ کینیڈا میں بیٹھ کر اردو کتابوں کے ایک ضخیم ذخیرے کا حصول کسی معجزے سے کم نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مدّبرانہ مضمون، کالم اور مقالے اردو کے معتبر جرائد اور رسالوں میں باقاعدگی سے

چھپتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی شخصیت تنقید اور تحقیق کے حوالے سے اردو ادبی حلقوں میں ممتاز و معتبر مانی جاتی ہے۔ اقبالؔ کے حوالے سے اتنے سنجیدہ اور نازک موضوعات پر علم اٹھا کر اُن سے کما حقہ انصاف کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ عابدی صاحب نے یہ کر دکھایا ہے جس کیلئے وہ لائق مبارکباد ہیں۔

(حُسن اتفاق دیکھئے کہ اظہار خیال کی یہ سعادت مجھے ماہِ اگست کے ان لمحات میں نصیب ہو رہی ہے جو تمام برّصغیر کیلئے مژدۂ آزادی بن کر آئے تھے۔ روئے سخن اُس ہستی کی جانب ہے جسے سراپا آزادی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ علامہ اقبالؔ آزادی کے پیامبر بھی تھے، منزل آزادی کے خضرِ راہ بھی اور جدوجہد آزادی کے علمبردار بھی۔ انسانی حقوق کے تحفظ میں اُن کا پیام ایک مجسّم آئین انسانیت کی مثال ہے۔)

آخر میں اپنے ذاتی حوالے سے اتنا کہوں گا کہ اس تخلیق نے ڈاکٹر عابدی کو ایک منفرد اور مُمتاز فہرست میں شامل کر کے انہیں ایک نیا تشخص عطا کیا ہے۔ انہوں نے علامہ اقبالؔ سے وہ تعلق قائم کر لیا ہے جس نے انہیں اب کلام و پیامِ اقبالؔ کی طرح ابدیت عطا کر دی ہے۔ اقبالؔ خود کہتے ہیں کہ

؎ اقبالؔ میرے نام کی تاثیر دیکھئے
میں جس کے ساتھ ہوں اُسے ممکن نہیں شکست

ظاہر ہے کہ یہ مژدہ جسے خود اقبالؔ کی جانب سے ملے اُس کے لئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے۔ اقبالؔ سے وابستگی اہلِ قلم حضرات کیلئے باعث افتخار ہی نہیں باعث نصرت بھی ہوا کرتی ہے۔ بارگاہ ایزدی میں میری دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس تعلق کے استوار رکھنے کی ہمت اور مہلت ملتی رہے اور وہ اس وابستگی کا اظہار اپنی تخلیقات کی صورت میں آئندہ بھی نہایت دل پذیر اور مؤثر انداز میں کرتے رہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمان عبدؔ

۱۴/اگست ۲۰۰۰ء

علامہ اقبالؔ کی دعا

اگرچہ دعا کا لفظ عربی ہے لیکن یہ سہ حرفی لفظ اردو اور فارسی میں کسی ترجمہ اور تفسیر کا محتاج نہیں۔ دین اسلام نے مسلمانوں کو دنیا اور عقبیٰ کے لیے دعا کرنے کی تاکید کی ہے۔ انسان عموماً اُن خواہشات کے لیے دعا کرتا ہے جس میں اُس کو امدادِ غیبی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دعا کے عنوان کے ذیل میں اسلامی علماء نے بتلایا ہے کہ دعا کسے کہتے ہیں؟ دعا کس سے مانگی جاتی ہے؟ دعا کس طرح کی جاتی ہے؟ دعا کس چیز کی کرنا چاہیے؟ دعا میں وسیلہ کی کیا اہمیت ہے وغیرہ مختلف طویل بحثیں ہیں جن کا ذکر یہاں خارج از محل ہے۔

علامہ اقبالؔ نے بانگ درا میں ''بچے کی دعا'' اور ''دعا'' کے زیرِ عنوان اُردو میں دو نظمیں لکھیں جن میں علامہ نے بچے کے توسط سے اور دوسری نظم میں کلمہ گو کے لیے دعا لکھی۔ اِن نظموں کے علاوہ بھی علامہ نے کئی اشعار میں دعا کے موضوع کو بڑے خاص طریقے سے پیش کیا۔

جس دعائیہ نظم کی بابت یہ مضمون بیان کیا جا رہا ہے وہ علامہ کی فارسی نظم "دعا" ہے جو زبورِ عجم میں تمہید کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ یہ سات اشعار پر مشتمل نظم اقبالؔ نے صرف اپنے لیے کہی ہے۔ اس نظم کے تجزیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے جو دعائیں مانگی تھیں وہ سب کی سب قبول ہوئیں۔ یہ نظم لفظ ''یارب'' سے شروع ہو کر بدہ یعنی ''دے'' پر ختم ہوتی ہے۔ عام انسانوں کی دعاؤں میں شخصی مسائل اور دنیاوی معاملات جن میں مال، عزّت، اولاد، طولِ عمر، کسب جاہ و حشم جیسے امور شامل ہوتے ہیں لیکن علامہ کی دعا میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں۔ اگرچہ یہ دعا براہ راست موصوف کے لیے تھی۔ لیکن ان تمام دعاؤں کا مقصد ملّتِ اسلام کی بہبود اور سرخ روئی کے سوا کچھ نہ تھا اس موقعہ پر اس عظیم دعا کا مختصر سا جائیزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

شعر(۱) یارب درون سینہ دل باخبر بدہ در بادہ نشّہ را نگرم آن نظر بدہ

(ترجمہ) اے خدا میرے سینے کے اندر باخبر دل دے۔ ایسی نظر دے جو شراب میں بھی پوشیدہ نشہ کو دیکھ سکے۔ قرآن اور احادیث کی روشنی میں مومن کی شناخت اُس کا بیدار باخبر دل ہے جو ہر لحظہ

صفحۂ ہستی پر لکھی ہوئی آیاتِ معرفت کی تلاوت کرتا ہے۔ اسی لیے تو کسی اور مقام پر علامہ نے فرمایا۔

کافری بیدار دل پیشِ صنم　　بہہ بہ دینداری کہ خفتے در حرم

(ترجمہ) ایک کافر بیدار دل کے ساتھ اپنے بت کے سامنے اُس مسلمان سے بہتر ہے جو کعبہ میں مردہ دل لیے بیٹھا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ دعا اقبالؔ کی ایسی مستجاب ہوئی کی اقبالؔ ایک باخبر زندہ دل شاعر کے نام سے مشہور ہوئے۔ دوسری دعا۔ ایسی نظر دے کہ شراب میں پوشیدہ نشہ کو دیکھ سکوں۔ اِس نظر کو نظرِ معرفتِ الٰہی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے جس کے توسط سے حق کو پہچانا جاتا ہے کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں خدا کا وجود موجود ہے۔ صرف نظرِ بصیرت چاہیے۔ صحیح تو یہ ہے کہ یہ دعا بھی اقبالؔ کی مستجاب ہوئی اور اقبالؔ نے اپنی دیدہ ریزی سے وہ مطالب کشف کیے کہ دنیا نے آپ کو اقبال لاہوری کے نام سے یاد کیا۔

شعر (۲) این بندہ را کہ بانفس دیگران نزیست　　یک آہِ خانہ ذا دمثالِ سحر بدہ

(ترجمہ) اس بندہ کو دوسروں کے خیراتی سانسوں پر زندہ نہ رکھ۔ سحر کی طرح ایک ذاتی شعلہ اور روشن آہ عطا کر دے۔

اقبالیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ علامہ نے اپنے مقام یا اپنے کلام کی بلندی کے لیے کسی کی مدد حاصل نہیں کی بلکہ اس سنگلاخ وادی کو اپنی محنت و مشقت اور تائیدِ الٰہی کے ذریعہ عبور کیا چوتھی دعا میں فرماتے ہیں مجھے سحر کی طرح ایک ذاتی روشنی اور روشن آہ عطا کر دے۔

اگرچہ علامہ نے مولانا رومؔ سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن خودی، رموزِ بے خودی کے فلسفوں میں جو کچھ روشنائی نظر آتی ہے وہ سب اُن کی ذاتی بصیرت اور پاکیزگیٔ خیال سے ہے یہ دونوں دعائیں بھی اقبالؔ کی زندگی ہی میں مورد قبول درگاہ ایزدی ہو گئیں تھیں۔

شعر (۳) سیلم مرا بجوی تنگ مایۂ مپیچ　　جولا نگہی بوادی وکوہ و کمر بدہ

(ترجمہ) مرے خیالات کے سیلاب کو تنگ نہروں سے مت گذار بلکہ اس کو وادیوں، کوہساروں، اور میدانوں میں بکھیر دے۔ علامہ اقبالؔ کو گذرے ہوئے ساٹھ (۶۰) سال کا عرصہ ہوا ہے۔ آج

علامہ اقبالؔ کا شمار مولانا رومؔ کے بعد سب سے مشہور مشرقی شاعر میں ہوتا ہے۔ علامہ کا کلام تقریباً دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ اور تشریح ہو چکا ہے۔ اقبالیات پر اس نصف صدی میں تقریباً بارہ سو سے زیادہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کیا اب بھی کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ یہ دعا اقبالؔ کی قبول نہ ہو سکی؟

شعر(۴) سازی اگر حریف یمِ بیکران مرا با اضطراب موج سکونِ گہر بدہ

(ترجمہ) کیونکہ مرا حریف موجود ہے اِس لیے میرے دریائے بیکران کو موجوں کا اضطراب اور مروارید کا سکون عطا فرما۔ علامہ کی زندگی میں اِن کے کلام اور پیام کو سمجھے بغیر نام نہاد لیڈروں اور بعض مسلم علماؤں کی جانب سے شدید مخالفت کی گئی۔ کفر کے فتوی منبروں سے دیئے گئے۔ شکوہ کی کتابیں خرید خرید کر جلائیں گئیں لیکن یہ گردکارواں اور دم گھٹانے والا دھواں دیرپا نہ رہا۔ اقبالؔ کے خیالات کا موجیں مارتا سمندر اور گہر دار ندرت فکر کے موتی عوام کے نصیب ہوئے۔ خدا نے اقبالؔ کی اِس دعا کہ بھی سرفراز کیا، چنانچہ اقبالؔ انگریز کی دہلیز پر سر نہیں ہوئے بلکہ آستان محمدی پر سرفراز ہو گئے۔

شعر(۵) شاہین من بصید پلنگان گذاشتی ھمّت بلند و چنگل از ین تیز تر بدہ

(ترجمہ) جب تو نے میرے شاہین کو چیتوں کے شکار پر مامور کیا ہے تو اُسے بلند ہمّت اور تیز پنجہ سے مسلح کر دے۔ کون اِس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ علامہ اقبالؔ کی تمام زندگی بڑی بڑی طاقتوں اور اہم شخصیتوں سے دست و پنجہ نرم کرنے میں گزری۔ اِتہام، بہتان، الزام کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کی شرارتیں آپ کی کمین میں تھیں لیکن اس جنگ و جدل میں بھی آخر کار اقبالؔ فتح یاب اور اقبال رہے اور اقبالؔ کے اشعار شاہین کے پنجوں کی طرح درندوں کو دریدتے رہے۔

شعر(۶) رفتم کہ طایران حرم را کنم شکار تیری کہ نا فکندہ فتد کار گر بدہ

(ترجمہ) میں حرم کے پرندوں کے شکار کے لیے جا رہا ہوں۔ مجھے ایسے تیر دے جو ہدف پر لگیں اور جو ٹوٹ کر بیکار نہ ہو جائیں۔

علامّہ اقبالؔ کی مثنوی سورہ اخلاص کا پہلا مکمّل ترجمہ

اگرچہ اُردو اور فارسی کے بعض شعرا نے قرآنی آیات اور احادیث کا منظوم ترجمہ کیا ہے لیکن میرے محدود مطالعہ میں سوائے علاّمہ اقبالؔ کے کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا جس نے قرآن کے ایک مکمل سورہ کی تفسیر اس انداز میں کی ہو ۔علاّمہ اقبالؔ نے رموزِ بے خودی میں خلاصہ مطالب مثنوی کے زیرِعنوان سورہ اخلاص کی تفسیر (۱۱۵) فارسی اشعار میں کی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ علاّمہ اقبالؔ احادیث اور قرآن پر گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور اِسی وجہ سے اِن کا کلام الہیات کا آئینہ محسوس ہوتا ہے علاّمہ نے اپنی نگارشات میں قرآن مجید کی منظوم تفسیر کا بھی ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن صحت کی خرابی اور بڑھتی ہوئی مصروفیات نے اس خواہش دیرینہ کو مکمل ہونے نہ دیا۔سورہ اخلاص جس کو سورہ توحید بھی کہتے ہیں قرآن مجید کا (۱۱۲) واں وہ عظیم معنی و معرفت خیز سورہ ہے جس کی بابت ابن عباسؓ حضورؐ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ اس سورہ کی عظمت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور تمام معارف اُصولی ، فروعی اور اخلاقی اس میں بیان کئے گئے ہیں۔علاّمہ اقبالؔ نے اس چار آیات کے چھوٹے سے سورہ کی تفسیر کر کے دراصل ایک تہائی قرآن کی تفسیر کی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اِس کے سمجھنے کے لئے اس کی ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ہمارے دور کے مشہور مفسّرِ قرآن آیت اللہ طباطبائی جنھوں نے ''المیزان'' میں قرآن کی مکمل تفسیر قرآن کی آیات ہی سے کی ہے فرماتے ہیں قرآن مجید کا ہر لفظ مفصّل اور اصل ہے اور اُسکا ترجمہ نقل اور بدل ہو ہی نہیں سکتا مثال کے طور پر ''حمد'' کا ترجمہ ''تعریف'' کیا جاتا ہے جب کہ خود ''تعریف'' لفظ عربی ہے چنانچہ خود خدا ''الحمد'' کی جگہ ''التعریف'' بیان کرسکتا تھا ، یعنی حمد کا مکمل بدل تعریف نہیں ہوسکتا ، بلکہ لفظ تعریف ''حـــمـــد'' کی کسی حد تک کہ ترجمانی کرسکتا ہے تاکہ اِس کے معنی ہماری سمجھ میں آسکیں۔

سورہ اخلاص کی چار آیات میں خداوندے عالم نے اصول ، فروع اور اخلاق کے بیکراں دریاؤں کو جن الفاظ کے کوزوں میں بند کیا ہے اُن میں چار لفظ **اللہ** ، **احد** ، **صمد** اور **کفو** قابل

علامہ اقبالؔ کی یہ انوکھی اور دلچسپ دعا ہے۔ اس دعائیہ شعر میں طائیران حرم یعنی نام نہاد مسلمان علماء اور نادان مولویوں کی طرف اشارہ ہے جو عوام کو اپنے ظاہری لباس سے دھوکا دیتے ہیں اور اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں چنانچہ ان کو افشا کرنا بڑا دشوار کام ہوتا ہے۔ یہ بُت جو اسلامی لبادہ اوڑھے ہوئے تھے علامہ نے نہ صرف انھیں بے نقاب کیا بلکہ نابود کر دیا۔ یعنی علامہ کی دعا مؤثر اور معتبر رہی۔

علامہ نے اس نظم کے آخری شعر میں دو دعائیں کیں۔ فرماتے ہیں۔

شعر (۷) خاکم بہ نور نغمۂ ای داودؑ برفروز ہر ذرہ ئ مرا پرو بالِ شرر بدہ

(ترجمہ) میری خاک کو حضرت داودؑ کے نغمہ کے نور سے روشن کر دے۔

میرے ہر ذرّہ کو شعلے کے ذرّوں کی طرح قوتِ پرواز عطا کر دے ۔

علامہ اقبالؔ کا کلام قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کا آئینہ ہے۔ خدا کی معرفت اور عشقِ رسالتؐ میں ڈوبے ہوئے یہ ترانے جب علامہ اپنے نرم ترنم میں پیش کرتے تو لوگوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہی تو نغمہ داودؑ کی دین تھی اور یہی تو دعا قبولیت کے آستانہ پر تھی۔ علامہ نے اپنی خاک کے ہر ذرّہ کو شعلہ فشانِ راز درون کر دیا اور اس نفسِ گرم کو شعروں میں ایسا پیوست کیا کہ آج بھی ہر شعر قاری کے خون کو جوش میں لانے اور اُس کی آہِ سرد کو آتشِ خرمن کفر بنانے کے لیے کافی ہے۔ یہ دس دعائیں علامہ نے سات اشعار میں مانگیں اور سب مستجاب ہوئیں۔

اِس گفتگو کے اختتام پر میں علامہ اقبالؔ کا وہ شعر جو اُنہوں نے مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمایا ہے رقم کرتا ہوں۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

ذکر وفکر ہیں اور اِسی معرفت کے دریا میں غوطہ زن ہو کر علامہ نے (۱۱۵) اشعار پر مبنی جو مثنوی لکھی اُس سے ظاہر ہے کہ علامہ نہ صرف مفکّر اسلام بلکہ ایسے مفسّر قرآن تھے کہ دیگر مفسّرین ان کی فکر معرفت کی گرد تک نہیں پہنچ سکے۔ ع۔فکر ہر کس بقدر ہمّت اوست۔

علامہ نے سورہ اخلاص کی پہلی آیت قل ھو اللہ احد پر(۱۸)،دوسری آیت اللہ الصمد پر(۵۱) تیسری آیت لم یلد ولم یولد پر(۱۹) اور چوتھی آیت ولم یکن لہ کفواً احد پر (۲۱) اشعار نظم کیے۔اگرچہ یہ مثنوی(۸۰) سال قبل فارسی میں لکھی گئی اور منظر عام پر آئی جس کے چیدہ چیدہ دو چار اشعار کے ترجمے اُردو میں ہوئے لیکن یہ پہلا مکمل اُردو میں ترجمہ ہے۔

(۱) میں نے رات خواب میں صدیق کو دیکھا اور اُن کے راستے کی خاک سے پھول چنے۔

(۲) وہ ہمارے مولا کا سکون وہ ہماری وادیٔ سینا کا پہلا کلیم ہے۔

(۳) اُس کی ہمّت ملّت کی زراعت کے لیے ابر کی مانند ہے اور وہ خود ثانیٔ اسلام وغار یار و بدر اور قبر ہے۔

(۴) میں نے اُس سے کہا اے اعلیٰ صفات والے عشقِ خاص تیری محبت تو دیوانِ عشق کا مطلع ہے۔

(۵) تیرے ہاتھوں سے ہمارے کام تکمیل ہوئے ہیں چنانچہ ہماری مصیبتوں کو حل کرنے میں مدد کر۔

(۶) فرمایا۔آخر کب تک تو لالچ اور ہوس کا غلام رہے گا اب سورہ اخلاص سے روشنی اور عظمت حاصل کر۔

(۷) یہ ایک نفس جو مومنوں میں گردش کرتا رہتا ہے توحید کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔

(۸) اُسی کے رنگ میں رنگ جا اور دنیا میں اُس کے جمال کا نقش بن جا۔

(۹) جب تو نے اپنا نام مسلمان رکھا ہے اور شرک سے توحید کی طرف رخ کیا ہے۔

(۱۰) کیوں اپنے آپ کو ترکی اور افغانی کہہ رہا ہے۔تجھ پر افسوس کہ تو وہی کا وہی باقی ہے اور اپنے کو بدل نہ سکا۔

(۱۱) مختلف ناموں سے اپنے آپ کو آزاد کر یعنی صراحی پر گذارا کر اور ساغروں کو چھوڑ دے۔

(۱۲) تو اپنے ناموں اور گروہ بندی کی وجہ سے رسوا ہوا ہے اور کچے میوہ کی طرح درخت سے گر گیا ہے۔

(۱۳) وحدت کو برقرار رکھ اور گروہ بندی سے کنارہ کشی کر۔ اپنی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے مت کر۔

(۱۴) اگر تو توحید کا پرستار ہے تو کب تک سبق گروہ بندی پڑھتا رہے گا۔

(۱۵) تو نے اپنے اوپر خود اپنا دروازہ بند کر لیا ہے۔ جو باتیں تیرے ہونٹوں پر ہیں انھیں دل میں بھی اُتار لے۔

(۱۶) تو نے ایک ملّت سے سو ملّتیں بنالیں اور اس طرح خود اپنی فصیلوں پر حملہ کیا ہے۔

(۱۷) ایک ہو جا اور توحید کا پرچار کر اور جو چیز غائب ہے اس کو اپنے عمل سے موجود کر۔

(۱۸) عمل سے ایمان کی لذّت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ایمان مردہ ہے جس میں عمل نہ ہو۔

(۱۹) اگر تو نے اللہ الصمد سے صحیح دل لگایا ہے تو سمجھ لے تو نے دنیا کی دامن گیر حدوں سے آزادی حاصل کر لی۔

(۲۰) اللہ کا بندہ دنیا کی چیزوں کا غلام نہیں ہے اور اُس کی زندگی ڈول کی مانند نہیں جو صرف بھر کر خالی ہو جاتا ہے۔

(۲۱) اگر تو مسلمان ہے تو غیروں کی منّت نہ کر بلکہ تمام جہاں کے لیے نیکی اور اچھائی کی مثال بن جا

(۲۲) دولت مند کے آگے اپنے روزگار کی شکایت نہ کر اور اپنے ہاتھ کو دوسروں کے سامنے مت پھیلا

(۲۳) حضرت علیؑ کی طرح جو کی روٹی پر زندگی بسر کر اور مرحب کی گردن توڑ کر قلعہ خیبر کو حاصل کر۔

(۲۴) اہل بخشش کی منّت کیوں کی جائے اور اُن کے ہاں اور نہیں کے خنجر کے زخم کیوں کھائیں جائیں۔

(۲۵) اپنے رزق کو پست افراد کے ہاتھوں سے مت لے کیونکہ تو یوسفؑ کنعان ہے اس لیے خود کو سستا فروخت نہ کر۔

(۲۶) اگرچہ تو ایک بے بال و پر کی چیونٹی ہی سہی لیکن اپنی حاجت حضرت سلیمانؑ سے بھی بیان نہ کر۔

(۲۷) راستہ بہت کٹھن اور دشوار ہے اس لیے اپنے ساتھ سامان کم رکھ اور چونکہ اس دنیا میں آزاد پیدا ہوا ہے اِس لیے تجھ کو آزاد ہی مرنا چاہیے۔

(۲۸) سبحہ اقلل من الدنیا کو شعار کر اور تعش حراً سے سرمایہ دار بن (قول فاروق ہے)

(۲۹) کوشش کر کہ کیمیا بن اور خاک مت رہ ' دنیا میں اہل بخشش بن اور فقیر مت رہ۔

(۳۰) اے ابوعلی کے مقام کو جاننے والے ایک گھونٹ بوعلی کے جام سے بھی نوش کر۔

(۳۱) تخت کیکاوس کو ٹھوکر مار دے، سر کو قربان کر دے مگر عزت اور ناموس کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔

(۳۲) خود بخود میخانہ کا دروازہ کھل جائے گا اُن بے نیازوں پر جن کے پیمانے خالی ہیں۔

(۳۳) اسلامی قاید ہارون رشید جس کی تلوار کا مزہ روم کے شہنشاہ فقفور نے چکھا تھا۔

(۳۴) مالک سے کہا اے قوم کے مولا آپ کے در کی خاک سے قوم کی قسمت روشن ہے۔

(۳۵) اے گلزار حدیث کے نواسنج تجھ سے حدیثوں کے رازوں کے درس چاہتا ہوں۔

(۳۶) کب تک لعل پردوں میں چھپا رہے گا اُٹھو اور دار الخلافت میں تشریف لاؤ۔

(۳۷) خوش رنگ ہے عراق کے دنوں کی روشنی اور خوش حال ہے حُسنِ نظر اور سوزِ عراق۔

(۳۸) آبِ خضر (آبِ حیات) اُس کی ٹہنی سے ٹپکتا ہے اور مسیحا کا زخم کا مرہم اُس کی خاک ہے۔

(۳۹) مالک نے کہا میں مصطفیٰ ؐ کا غلام ہوں اور میرے سر میں سوائے اُس کے عشق جنوں کے اور کچھ نہیں۔

(۴۰) میں شکار کے تھیلے کے مانند ہوں اور میں اس حریم پاک سے اُٹھ نہیں سکتا۔

(۴۱) میں خاک یثرب کی خوشبو سے زندہ ہوں اور عراق کے دن سے یہاں کی رات اچھی ہے۔

(۴۲) عشق کہتا ہے کہ میرا کہنا مان اور بادشاہوں کو خدمت گذاروں کی طرح بھی ساتھ مت رکھ۔

(۴۳) تو چاہتا ہے کہ میرا آقا بن جائے اور مجھ جیسے آزاد بندہ کا مولا بن جائے۔

(۴۴) تعلیم کے لیے تیرے دروازے پر آئے ہیں ' ملّت کا خادم تو تیرا نوکر نہیں بن سکتا۔

(۴۵) اگر علمِ دین سے فایدہ اٹھانا چاہتا ہے تو میرے حلقۂ آموزش میں بیٹھ۔

(۴۶) بے نیازوں کے عجیب ناز ہوتے ہیں اور ان کے ناز کے انداز بھی عجیب ہوا کرتے ہیں۔

(۴۷) بے نیاز رہنا حق کے رنگ میں رنگ جانا ہے اور تمام رنگ سوائے پیراہن کے رنگ کے دھونے کے برابر ہیں۔

(۴۸) تو نے غیروں کا علم سیکھا یعنی اپنی صورت پر اغیار کا غازہ ملا ہے۔

(۴۹) یہ بڑائی اور عزت کو تجھ سے چھین لیتی ہے اور مجھے نہیں معلوم اب وہ تو ہی ہے یا کوئی دوسرا۔

(۵۰) تیری خاک نے اس کی نسیم سے فایدہ نہیں اُٹھایا چنانچہ گل اور ریحان سے گود خالی رہی۔

(۵۱) اپنی کشت اپنے ہاتھوں سے برباد مت کر اور ابروں سے بارش کی بھیک مت مانگ۔

(۵۲) تیری عقل غیروں کی فکر کی اسیر ہے اور تیرے حلق میں غیروں کے نفس کی آواز ہے۔

(۵۳) تیری زبان پر دوسرے سے لی ہوئی ادھار گفتگو اور تیرے دل میں دوسروں کی ادھار آرزوئیں ہیں

(۵۴) تیری قمریوں کو نواؤں نے چاہا اور تیرے سرو کو قباؤں نے چاہا۔

(۵۵) دوسروں سے شراب اپنے ساغر میں لے رہا ہے اور وہ بھی ساغر جو دوسروں سے قرض میں لیا ہوا ہے

(۵۶) وہ اُن کی نگاہ ما ذاغ البصر کاش اگر اپنی قوم کی جانب پلٹ آئے۔

(۵۷) شمع صرف پروانے کو جانتی ہے اور اپنے اور غیروں میں فرق محسوس نہیں کرتی۔

(۵۸) میری قوم میں سے نہیں ہے جو ہمارے حضورؐ فر مارہے ہیں۔ افسوس صد افسوس اور وائے ہو تجھ پر۔

(۵۹) ستاروں کی طرح زندگانی کب تک کرو گے اور اپنی ہستی کو کب تک سحر میں گم کرتے جاؤ گے۔

(۶۰) تو دھوکا صبح کاذب سے کھا چکا اور اپنا بچھونا افلاک کی وسعت سے اُٹھا چکا ہے۔

(۶۱) تو سورج ہے اگر اچھی طرح سے اپنے آپ کو دیکھے اس لیے تجھے دوسرے ستاروں سے روشنی خریدنے کی ضرورت نہیں۔

(۶۲) اپنے دل پر دوسروں کا نقش اُتارا ہے اور خاک کو نور کے بدلے حاصل کیا ہے۔

(۶۳) کب تک دوسروں کی روشنی سے چمکے گا اور کب تک دوسروں کی شراب سے مست رہے گا۔

(۶۴) کب تک غیروں کی محفلوں کے چراغ کا طواف کرے گا اگر تجھ میں ہمّت ہے تو اپنی خودی کی آگ میں جل اور جہان کو روشن کر۔

(۶۵) نظر کی طرح اپنے ہی پیروں پر چل ' اچھل مگر اپنی ہی جگہ قائم رہ۔

(۶۶) اے عقلمند دنیا میں حباب کے مانند اپنے خلوت خانہ کو غیروں پر بند رکھ۔

(۶۷) کبھی صرف ایک ایک فرد نے بھی خود کو منوایا اور کبھی قوم نے بھی اپنے ساتھ ساخت اور باہمی کام

انجام دیا۔

(۶۸) مصطفیٰؐ کے پیام سے آگاہ ہو جا اور ارباب دون اللہ سے نجات حاصل کر۔

(۶۹) تیری قوم رنگ اور خون حسب اور نسب سے بلند تر ہے۔ یہاں ایک کالے کی قیمت بھی سو گوروں سے بڑھ کر ہے۔

(۷۰) جناب قنبر (حضرت علیؑ کے غلام) کے وضو کے پانی کے ایک قطرے کی قیمت روم کے شہنشاہ کے خون سے بڑھ کر ہے۔

(۷۱) تو قوم، قبیلہ اور خاندان کی بندیشوں سے آزاد ہو کر حضرت سلمانؓ فارسی کی طرح اسلام کا فرزند ہو جا۔

(۷۲) اے ہوشیار ساتھی اس نکتہ پر غور کر شہد کو شہد کے چھتے کے خانوں میں دیکھ کر سبق سیکھ۔

(۷۳) جس میں ایک قطرہ گُلِ لالہ سے ہے تو ایک قطرہ نرگسی پھول سے ہے۔

(۷۴) ایک قطرہ یہ نہیں کہتا کہ میں نرگس کے پھول سے ہوں اور دوسرا یہ نہیں کہتا کہ میں نیلوفر کے پھول سے ہوں۔

(۷۵) ہماری ملّت کی شان ابراہیمیؑ ہے اور ایمان ابراہیمیؑ ہی ہمارا شہد ہے۔

(۷۶) اگر نسب اور قبیلہ اور خاندان کو ملّت کا جزو بناؤ گے تو اسلامی برادری میں شگاف ڈالو گے۔

(۷۷) ہماری سرزمین میں یہ منحوس جڑیں کبھی بھی مستحکم نہ ہونے پائیں کیوں کہ غیر مسلم ہماری تاک میں بیٹھے ہیں۔

(۷۸) ابن مسعود جو عشق کا روشن چراغ ہے جسکے جسم اور جان سرتاپا عشق کی آگ میں جلتے رہیں ہیں۔

(۷۹) اس کا سینہ بھائی کی موت سے جل اُٹھا اور درد و حرارت سے احساس کا آئینہ پانی پانی ہو گیا۔

(۸۰) اُس نے اپنے رونے کو ختم نہیں کیا بلکہ وہ غم میں ایک ماں کی طرح روتا رہا۔

(۸۱) اے افسوس وہ جو نیاز کا سبق پڑھتا ہے میرا دوست جو مدرسہ نیاز کے اندر تھا۔

(۸۲) آہ وہ سروِ چمن جو عشق نبیؐ کے راستے میں میرا ہم سفر اور ہم پلّہ تھا۔

(۸۳) افسوس کہ وہ نبیؐ کے دربار سے محروم اور میری آنکھیں دیدار نبیؐ سے روشن ہیں۔

(۸۴) ہمارا رشتہ اور تعلق روم اور عرب سے نہیں ہے اور ہمارے رشتے کو نسب کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

(۸۵) ہم نے اپنا دل حضورؐ سے باندھا ہے اور اِسی رشتے سے ہم ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہیں۔

(۸۶) ہمارا رشتہ صرف حضورؐ کی محبت سے ہے اور ہماری آنکھوں کے لیے اُن کی صبا کا خمار کافی ہے۔

(۸۷) جب اُس کے نشہ کا اثر ہمارے خون میں دوڑتا ہے تو وہ فرسودہ عقائد کو جلا کر اپنی روشنی پیدا کرتا ہے۔

(۸۸) حضورؐ کا عشق ملّت کا سرمایہ ہے اور ملّت کی رگوں میں خون کی طرح بھرا ہوا ہے۔

(۸۹) عشق ہی جسم کی جان اور نسب ہے اور عشق کا رشتہ نسب کے رشتے سے مستحکم تر ہے۔

(۹۰) اگر عشق کرنا ہے تو نسب کی بندشوں کو چھوڑا جائے اور ایران و عرب کے تفرقوں سے کنارہ کشی کیجائے۔

(۹۱) حضورؐ کی امت بھی حضورؐ کی طرح حق کا نور ہے۔ اسلئے ہمارا وجود حضورؐ کے وجود سے ہی قابل شناخت ہے۔

(۹۲) نورِ حق کی ابتدا اور وجود کے بارے میں جب کوئی تحقیق نہیں کر سکتا تو کیا ضرورت ہے کہ حق کی خلقت کے نسب اور نسل پر تحقیق کی جائے۔

(۹۳) ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو قبیلہ اور خاندان کی بندیشوں میں بند رکھے وہ " لم یلد ولم یولد " سے بالکل بے خبر ہے۔

(۹۴) مسلمان نے دنیا سے کیا آنکھیں موڑ لیں ہیں اور دل کی فطرت حق سے پیوستگی کیا ہے۔

(۹۵) وہ لالہ جو پہاڑ کی چوٹی پر اُگتا ہے وہ کبھی گل چین کے دامن کو نہیں دیکھ نہیں سکتا۔

(۹۶) اُس کی آگ شعلے بلند کرتی ہے زمین پر، سحر کی پہلی ساعتوں میں۔

(۹۷) آسمان نے اپنے آغوش سے نہیں نکالا وہ تارہ جو اُس کے غرور و تکبّر کا وسیلہ تھا۔

(۹۸) پہلے سورج کی کرن نے اُس سے پیار کیا اور شبنم نے اُس کی آنکھوں سے خواب کی گرد کو دھویا۔

(۹۹) لم یکن یعنی خدا سے رشتہ ایسا مظبوط کیا جائے کہ تو ساری اقوام عالم میں یگانہ اور بے مثال رہے۔

(۱۰۰) جب خدا کی ذات واحد اور لاشریک ہے جو اس کے بندے کو بھی بے مثال اور یگانہ ہونا چاہیے۔

(۱۰۱) مومن ہر بلندی سے بلند تر ہے۔ اور اور اس کی عزّت کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔

(۱۰۲)لا تحزنو کی پوشاک اس کے تن پر ہے اور "انتم الاعلون" کا تاج اُس کے سر پر ہے۔

(۱۰۳)وہ اپنے کاندھوں پر دو عالم کا بوجھ اُٹھاتا ہے اور برّ اعظم بھی اُس کی آغوش میں پلتے ہیں۔

(۱۰۴)آواز تیز ہمیشہ گوش زد ہوتی ہے اور اگر بجلی بھی گرے تو یہی اپنے بازو پر لے لے گا۔

(۱۰۵)اُس کی چنگاری کی مٹھی میں سو شعلے ہیں اور اس کی زندگی اُس کے جوہر سے کمال پر پہنچتی ہے۔

(۱۰۶)اس دنیا کے شور و شین میں اُسے کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی سوائے مومن کی تکبیر کی دل نشین آواز کے۔

(۱۰۷)اُس کا عدل بخشش اور احسان بہت عظیم ہے اس کے مزاج کے اندر قہر بھی ہے اور وہ کریم بھی ہے۔

(۱۰۸)اُس کی نوا بزم کی دلنشین آواز ہے اور اُس کی رزمگاہ کی گرمی آہن پگھلا دیتی ہے۔

(۱۰۹)وہ گلستانوں میں بُلبلوں کے ہمراہ ہم آواز ہے اور بیابانوں میں باز کی طرح شکاری ہے۔

(۱۱۰)اس کا دل آسمانوں کے نیچے آرام نہیں لیتا بلکہ اس کا وجود افلاک پر سکون حاصل کرتا ہے۔

(۱۱۱)اس کی فکر کا طائر پرواز سورج پر چونچ مارتا ہے اور اُس کا خیال آسمانوں کے اُس پار معرفت کے نور سے روشن ہے۔

(۱۱۲)تو نے پرواز کے لیے اپنے پر نہیں کھولے اور تو ایک کیڑے کی طرح خاک میں آرام سے لیٹا ہوا ہے۔

(۱۱۳)تو ذلیل اور خوار اس لیے ہوا کہ تو نے قرآن سے جدائی اختیار کر لی اور پھر اپنی تمام شکستوں کو زمانہ کی گردشوں کا بہانہ قرار دیا۔

(۱۱۴)تو شبنم کی طرح زمین پر پڑا ہوا ہے کیا تجھے معلوم نہیں ہے کہ تیرے بغل میں ایک زندہ کتاب یعنی قرآن بھی ہے۔

(۱۱۵)کب تک خاک کو اپنا وطن بنائے رہے گا اپنا بستر اٹھا اور آسمانوں کی تلاش میں گم ہو جا۔

علامہ اقبالؔ کی نعتیہ شاعری

نعت گوئی حضورؐ کی زندگی میں شروع ہوئی اور یہ سلسلہ آیت قرآن کے پیش نظر ''رفعنا لک ذکرک'' قیامت تک جاری رہے گا۔ حسان بن ثابت سے لے کر آج تک نعت کے میدان میں ہر نعت گو نے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ نعتیہ مضامین میں اپنے عقیدتی اور جذباتی رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ نعت میں عموماً حضورؐ کے سراپا، حسن و جمال، کمال و فضائل اور آپ کے دیار سے مربوط مسائل پر زور دیا گیا۔ تقریباً تمام شعرا کے پاس یہی صورت حال نظر آتی ہے لیکن علامہ کے پاس نعتیہ مضامین میں سیرت و صفات رسولؐ، تعلیمات اسلام اور تبلیغ دین کے علاوہ عشق محمدؐ کا گہرا رنگ نظر آتا ہے جو مسلمانوں کی بگڑی بنانے کا موثر علاج تلقین کیا گیا ہے۔ علامہ سے پہلے اور علامہ کے بعد بھی کسی بھی فارسی یا اُردو شاعر کے پاس یہ کیفیت اس انداز میں موجود نہیں۔ علامہ کے فلسفہ عشق محمدیؐ میں

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست رحمت للعالمینؐ انتہا است

نعتیہ کلام میں اقبالؔ کا آہنگ جدا ہے۔ الفاظ اور ہیں سوز گداز مختلف ہے۔ اسلوب منفرد ہے عشق و مستی کے معیار اور پیمانے جو انھوں نے اپنے لئے بنائے ہیں تمام دوسرے پیمانوں سے بازی لے گئے۔

عشق دمِ جبرئیلؑ عشق دمِ مصطفیٰؐ عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

طرح عشق انداز اندر جان خویش تازہ کن با مصطفیٰؐ پیمان خویش

اقبالؔ کا ذہنی ارتقا اور قلبی واردات کا اثر کچھ اتنا گہرا اور گیرا تھا کہ ان مضامین کی عکاسی اور نقاشی اتنے بھرپور انداز میں ان کے سوا اور کسی کے بس کی بات نہیں۔ کہتے ہیں۔

از مقام او اگر دور ایستی از میان محشر ما نیستی

یعنی اگر حضورؐ کی قربت سے دوری ہو جائے تو وہ شخص ہمارے گروہ سے خارج ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

دامنش از دست دادن مردن است چوں گل از باد خزاں افسردن است

یعنی حضورؐ کے دامن کو چھوڑنا ہلاک ہونا ہے جیسا کہ باد خزاں سے پھول مرجھاتا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے حضورؐ اکرم کو مرد کامل، نفس مطمینہ اور عبدہٗ کہہ کر عبد اور عبدہٗ کے فرق کو بڑے ہی

خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ہم اس مقام پر چند اشعار اس مضمون پر پیش کر کے اس فلسفہ عبدہ کو واضح کریں گے۔

پیش او گیتی جبین فرسودہ است خویش را خود عبدہ فرمودہ است

یعنی اُس کے سامنے زمین سجدہ ریز ہے اگر چہ اُس نے خود اپنے آپ کو عبدہ کہا ہے۔

عبدہ از فہم تو بالا تر است آدم است وہم زآدم اقدم است

اُس کا جوہر عرب اور عجم ہونے سے نہیں بلکہ اُسکی آدمیت سے ہے جو آدم ہوتے ہوئے بھی آدمی سے افضل ہے۔

عبدہ صورت گر تقدیر ہا اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا

عبدہ سے تقدیریں بنتی ہیں اور ویرانے سنورتے ہیں۔

عبدہ با ابتدا بے انتہا است عبدہ را صبح و شام ما کجا است

عبدہ ابتدا سے ہے اور اسکی انتہا نہیں وہ ہماری طرح گردش چرخ میں محصور نہیں۔

کس زسر عبدہ آگاہ نیست عبدہ جز سر الا اللہ نیست

کوئی بھی سوائے خدا کے عبدہ کے راز سے واقف نہیں کیونکہ وہ خود اللہ کا راز ہے۔

لاالہ تیغ و دُم او عبدہ فاش تر خواہی بگو ھو عبدہ

لاالہ کی شمشیر کی دُم عبدہ ہے اور اگر کھلے لفظوں میں کہوں تو حق عبدہ ہے۔عرفی شیرازی نے نعت کے متعلق کہا تھا کہ یہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز راستہ ہے یہاں ذرا سی لغزش سے ثواب مورد عتاب بن سکتا ہے اور اسی باریک راہ پر اقبال نے ایسی خانقاہیں بنائیں کہ جس پر رہ کر مومن مئے حُب محمدؐ سے سرشار اور مست رہتا ہے۔اسی لئے تو عبدالسلام ندوی نے '' اقبال کامل'' میں لکھا کہ ''ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے عنوانات میں سب سے پُر جوش پُر سوز اور پُر درد عنوان نعتیہ شاعری کا ہے۔سچ پوچھئے تو نعتیہ شاعری ڈاکٹر صاحب کی پوری شاعری کا خلاصہ ہے۔روضہ رسولؐ کی زیارت کی تمنا' مدینہ کی گلیوں کو دیکھنے کا اشتیاق اور مدینہ سے دوری کا غم شعرا کا محبوب مضمون رہا ہے۔

علامہ نے بھی دیار نبیؐ کے موضوع کو اپنایا لیکن ان کا رنگ اور ان کا مقصد جذبۂ قلب کی لذت کے علاوہ امت مسلمہ کی مرکزیت' وحدت ملّی کی اہمیت اور مسلمانان جہان کے لئے اس کی عظمت بن کر ظاہر ہوا۔ وہ مدینہ کو ملّت اسلامیہ کا مرکز تصوّر کرتے ہیں کیونکہ رسولؐ معظم جو تمام مسلمانوں سے وابستہ ہیں مدنیہ میں مدفن ہیں۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است — بے خنک شہری کہ آنجا دلبر است
حلقۂ ملّت محیط افزائیشی — مرکز او وادیٔ بطحا ستی

مدینہ دائیرہ ملّت کا مرکز ہے۔

ما زِ حکم نسبت او ملیتم — اہل عالم را پیام رحمتم

ہم ان کی نسبت کی وجہ سے ملّت بنے اور انہی کے کرم سے دنیا والوں کو پیام رحمت دیتے ہیں۔

آہ یثرب مونس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو — نقطۂ جاذب تاثیر کی شعاعوں کا ہے تو
ہے اگر قومیت اسلام پابند مقام — ہندی بنیاد ہے اس کی نہ فارسی ہے نہ شام
خاتم ہستی میں تو تاباں ہے مانند نگیں — اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمین
تجھ میں راحت اس شہنشاہ معظّم کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی

ملّت کا درد اور اس کے درمان کی طلب اقبالؔ کی نعتیہ شاعری کا خاص رنگ ہے۔ قوم کی بدبختی' بدحالی' بیکسی اور بے نوائی کا دکھڑا رنج والم درد وغم کے ساتھ میر ملّت واُمّ کے دربار میں سوز وگداز کے لہجہ میں سُنایا جارہا ہے۔ اور ملّت کی ہدایت کامرانی اور ترقی کی دعائیں مانگی جارہی ہیں۔

شیرازہ ہوا ملّت مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے
وہ لذّت آشوب نہیں بحر عرب میں — پوشیدہ جو مجھ میں ہے وہ طوفاں کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ — آیات الٰہی کا نگہباں کدھر جائے
کرم اے شہ عرب وعجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم — وہ گدا کے تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری

سوز وگداز اور معانی سے لبریز نعتیہ اشعار کہنا صرف علامہ کا ہی حق معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ عبدالرحمان

جامی کے دلکش انداز کو سراہاتے ہوئے علامہ نے فرمایا تھا۔

کشتۂ اندازِ ملّا جامی ایم نظم و نثر او علاج خامی ایم

یعنی میں جامی کے انداز پر مر مٹا ہوں اور ان ہی کا کلام میرے درد کا علاج ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

شعر لب ریز معانی گفتہ ام در ثنائے خواجہ گوہر سُفتہ ام

میں نے مطالب و معانی سے لبریز اشعار کہے ہیں اور حضورؐ کی مدح میں سچے موتیوں کی نظم تیار کی ہے۔

علامہ اقبال اپنے نعتیہ اشعار میں مسلمان کا تعلق اور اس کی وابستگی کو صرف اسلام ہی سے بتاتے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق اسلام کی مکمل عملی تربیت بارگاہ نبویؐ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جب مولانا حسین احمد مدنی نے ''ملّت از وطن است'' کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کے جذبات پر ایک کاری ضرب لگانے کی کوشیش کی تو علامہ نے فوراً ان کو ٹوکا۔

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ اور نرسدی تمام بولہبی است

علامہ اقبال یہاں سعدی شیرازی کے ہم خیال ہیں۔ سعدی کہتے ہیں۔

محال است سعدی کے راہ صفا تواں رفت جز در پئے مصطفیٰؐ

خلاف پیغمبرؐ کسی راہ گزید کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

بیسویں صدی کے شروع میں جو وطنیت کی پکار اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی تھی اُس سے متاثر ہو کر علامہ نے فرمایا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ ملّت کا کفن ہے

پھر اس نظم کے تسلسل کو اس طرح قائم رکھتے ہیں۔

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانۂ دین نبویؐ ہے

بازو تیرا توحید کی قوّت سے قوی ہے اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے تو دکھا دے اے مصطفویؐ خاک میں اس بت کو ملا دے

اقبال پھر کہتے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وطن پر نہیں بلکہ منسلک اور آئین پر ہوتی ہے اگر وطن پر ہوتی تو

حضورؐ مکّہ کو ترک نہ کرتے۔

ہے ترک وطن سُنّت محبوبؐ الٰہی　　دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے　　ارشاد نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

علامہ اقبالؔ اپنے نعتیہ اشعار میں عشق محمدی کو ہی اتحاد ملّی کا محور بتاتے ہیں۔ اتحاد ملّی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ۱۹۲۶ء کے میلاد النبی کے ایک جلسہ میں فرماتے ہیں۔ ''مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا راتیں غور وخوص میں گذار دیں تا کہ وہ حقیقت معلوم کروں کہ جس پر کاربند ہو کر عرب سرور کائناتؐ کی صحبت میں (۲۳) سال کے اندر دنیا کے امام بن گئے وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے۔ حضورؐ اکرام کا اُسوہ حسنہ اور خُلقِ عظیم اقبالؔ کی نعتیہ شاعری کا تاج تصوّر کیا جاتا ہے۔ اقبالؔ حضورؐ کی مدح سرائی کو ناممکن سمجھتے ہیں اسی لئے تو فرماتے ہیں۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب　　گنبد آبگینہ رنگ ترے محیط میں حُباب
شوکت سنجر وسلیم ترے جلال کی نمود　　فقر جنید و بایزید ترا جمالِ بے نقاب

حضورؐ کے کردار اور خلق عظیم سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔

در نگاہ او یکی بالا و پست　　با غلام خویش بر یک خواں نشت

حضورؐ کی نظر میں امیر وغریب صغیر وکبیر آقا اور غلام سب برابر تھے۔

حضورؐ کی تعلیمات کی وجہ سے نسلی اور نسبی امتیازات مٹ گئے۔ حضورؐ سب انسانوں کو اللہ کی مخلوق اور یکساں قرار دیتے تھے۔

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت　　آتش او ایں خس و خاشاک سوخت

جب یمن کے قبیلہ بنی طے کو اسلامی فوجوں سے شکست ہوئی اور سردار طے کی بیٹی کو اسیر کر کے دربار نبویؐ میں پیش کیا گیا اور حضورؐ نے اُسے اپنی چادر سے ڈھانکا اور آزاد کر دیا۔

دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید　　چادر خود پیش روے او کشید

علامہ اقبالؔ اس حساس مقام پر مسلمانوں کی بے سروسامانی، غلامی اور افلاس کا عجیب انداز میں ذکر

کرتے ہیں جو اس نعتیہ مضمون کے اثر کو چند برابر کر دیتا ہے اور اصلاح ملّت کا باعث ہوتا ہے۔ ایسی فکر و نظر دوسرے شعرا کے نعتیہ کلام میں نظر نہیں آتی۔ اقبالؔ کہتے ہیں ہم طے قبیلہ کی اُس لڑکی سے زیادہ ننگے ہیں ہم اپنے کردار اور عمل کی وجہ سے احترام عالم کے سامنے برہنہ ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کی روز محشر حضورؐ ہی سے ہمارا اعتبار قائم ہے اور دنیا میں بھی ہماری عزّت و آبرو کا نگہبان وہی ہے۔

ما از آں خاتون طے عریاں تریم پیش اقوام جہاں بیچادر یم
روز محشر اعتبار ماست او در جہاں ہم پردہ دار مامست او

علامہ اقبالؔ حضورؐ اکرم کے وجود رحمت کو مسلمانوں کی بقا کا ضامن قرار دیتے ہیں۔

ماند شب ھا چشم او محروم نوم تابہ تخت خسروی خوابید قوم

حضورؐ تمام رات عبادت میں جاگتے رہے اور اسی کے طفیل رحمت سے ملّت اسلامیہ تخت خسروی پر آرام سے سو سکی۔

حضورؐ ہی کی بدولت ملّت اسلامیہ ایک نقطہ اور ایک دائرہ میں جمع ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ۔

چوں گل صد برگ مارا بو یکی است او ست جان ایں نظام واو یکی است

ہم گلاب کی سو پنکھڑیوں کی طرح ہیں لیکن ہماری خوشبو ایک ہی ہے جو ہمارے معاشرے اور نظام کی جان ہے وہ بھی صرف ایک ذات برگزیدہ حضورؐ اکرم ہے۔ جس کا لطف اور قہر دونوں بھی دنیا والوں کیلئے رحمت ہیں۔

لطف و قہر اور سراپا رحمتی آں بیاراں ایں با اعدا رحمتی

علامہ اقبالؔ فنافی الرسولؐ تھے

یہ سچ ہے کہ علامہ اپنی ابتدائی عمر ہی سے عاشق رسولؐ تھے لیکن جس زمانے میں وہ فلسفہ خودی کے نشہ میں چور تھے اس موضوع پر کچھ زیادہ نہ لکھ سکے مگر آخری عمر میں جب ان کے دل میں عجیب سوز و گداز پیدا ہوا تو انھوں نے پھر نعتیہ شاعری کی طرف توجہ کی اور اس موضوع پر خصوصاً ارمغان حجاز میں بہت کچھ لکھا۔ علامہ آخری عمر میں فنافی الرسولؐ ہو گئے تھے۔ آپ کا اسم گرامی سنتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور اگر لیٹے ہوئے رہتے تو تڑپ کر اٹھ بیٹھتے۔ حضورؐ کا اسم گرامی زبان پر لانے سے پہلے اپنے جسم کی طہارت کے سلسلے میں اطمینان کر لیا کرتے۔ علامہ کی نعتیہ شاعری کی جان ان کا سچا عشق رسولؐ ہے جس کی بدولت ان کے کلام میں فراوانیٔ جذبات، بلندی تخیل فکر و نظر، تاثیر و اعجاز، درد و لذّت اور حکیمانہ و فلسفیانہ اقدار کا بحرِ زخّار موجیں مارتا نظر آتا ہے۔ عشق رسولؐ میں لکھا گیا ہر شعر تارِ رباب کی طرح درد و کرب کی موج معلوم ہوتا ہے۔ مصرع قلب و جگر کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں جنھیں اقبالؔ نے نکال کر رکھ دیئے ہیں۔ یہ سب عشق محمدیؐ کا کرشمہ ہے۔ عشق اگرچہ عربی لفظ ہے لیکن قرآن و حدیث اور شعرائے جاہلیت کے کلام مین یہ لفظ نظر نہیں آتا۔ متاخرین شعرائے عرب نے بھی اس لفظ کو بہت کم استعمال کیا ہے اور عشق کی وہ اہم خصوصیات جو فارسی اور اُردو شاعری میں نظر آتی ہیں ان کا تو عربی شعرا کے کلام میں وجود ہی نہیں ہے۔ عشق کا فلسفہ اور اس کا مفہوم علامہ اقبالؔ کی شاعری میں جوش اور جذب کا مفہوم رکھتا ہے۔ علامہ نے عشق کا تصوّر مولانا رومؔ سے لیا اور مولانا رومؔ کے تصوّر عشق کا مبدا قرآن ہے۔ پروفیسر محمد فرمان لکھتے ہیں ''اقبالؔ منازل سلوک میں جذب کی راہ سے مقام فنافی الرسولؐ پر فائز تھے اور اس سلسلے میں اس مقام سے بالاتر کوئی اور مقام نہیں۔ یہیں سے عبدیت کا احساس ہوتا ہے اور عمل کی شدّت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ شاعری جو ایک قوم کے قلب کو متحرک کر دے اگر بجائے خود ایک کردار و عمل ہے تو اقبالؔ کی زندگی پیہم عمل تھی''۔ اقبالؔ کے فلسفہ عشق میں عشق ہی جملہ کمالات کا منبع اور تمام فیوض اور تبرکات کا سرچشمہ ہے۔ اقبالؔ عقل کو نہیں بلکہ عشق کو امام جانتے ہیں۔ وہ عقل کو کم مایہ و ناقص اور عشق کو کامل جانتے ہیں۔

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا　　عشق تمام مصطفیؐ عقل تمام بو لہب

چناں چہ اقبالؔ اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ عقل کو اس کے حدود میں رکھ کر عشق سے تمسک اختیار کیا جائے تا کہ منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیابی ہو۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل تھی محو تماشہ لب بام ابھی

پھر فرماتے ہیں۔

ہر کہ عشق مصطفیؐ سامان اوست　　بحر و بر در گوشہ دامان اوست

جو بھی عشق محمدیؐ سے سرشار ہے اس کے اختیارات کے ایک حصّے میں تمام بحر و بر ہیں۔

اقبالؔ عشق کو کائنات کے جملہ اقسام کی حرکت اور ان کے صفات کی جان تصوّر کرتے ہیں۔ عشق کی قوت سے ہر چیز کو حاصل کیا جاسکتا ہے اور اسی سے عقیدہ اور اعتقاد کامل ہوتا ہے۔

ع۔ عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصوّرات۔

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک　　عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

اقبالؔ کہتے ہیں مومن دنیا میں ضروریات زندگی یعنی صرف کھانے اور سونے کی بدولت زندہ نہیں بلکہ عشق محمدیؐ کی وجہ سے زندہ ہے۔

مومناں زیر سپہر لا جورد　　زندۂ عشق اند نے خواب و خورد

می ندانی عشق و مستی از کجا　　ایں شعاع آفتاب مصطفیؐ است

مصطفیؐ بحر است و موج او بلند　　خیزد ایں دریا بہ جوی خویش بلند

تو اسی کو اپنے دل میں سمو لے تا کہ اس غرق کی بدولت حضورؐ کے کمالات کی جھلک اپنے میں پیدا کر لے۔ اسی لئے تو فرمایا۔

وہ دانائے سبل ختم الرسلؐ مولائے کُل جس نے　　غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر　　وہی قرآں وہی فرقاں وہی یسینؐ وہی طاہاؐ

علامہ فرماتے ہیں رسولؐ خدا کے عشق نے میرے پرسکون سینے میں ہیجان برپا کیا چناں چہ سیکڑوں نغمے

میرے سینے میں بے تاب ہیں۔

شور عشقش در نئے خاموش من　　می تپد صد نغمہ در آغوش من
در تپید دم بدم آرام من　　گرم تراز صبح محشر شام من

(حضورؐ کی محبت کی حرارت سے میری راتیں روز محشر کی گرمی سے بھی ذیادہ گرم ہیں)

علامہ نے اپنے پیام میں صاف طور سے یہ بیان کیا کہ اسلام کا محور اور ایمان کا جوہر ''عشق محمدیؐ'' ہے۔علامہ کی شاہکار نظم ''جواب شکوہ'' کا ماحصل بھی ''عشق محمدیؐ'' ہی ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے　　دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے
چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے　　رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ نے ساری عمر مسلمانوں کو عشق رسولؐ ہی کا پیغام دیا۔اُن کا پکا یقین ہے کہ مسلمان صرف عشق رسولؐ کی بدولت ہی دنیا میں اور آخرت میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق
عقل و دل و نگاہ کا مرشد اوّلیں ہے عشق　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصوّرات
عشق دم جبرئیلؑ عشق دم مصطفیٰؐ　　عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

پھر فرماتے ہیں

طرح عشق انداز جان خویش　　تازہ کن با مصطفیٰؐ پیمان خویش

یعنی اپنے دل میں عشق کا بیج بُو لے اور پھر سے پیمان مصطفیٰؐ کو تازہ کر لے کیوں کہ۔

سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا　　اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

جب علامہ اقبالؔ کو یہ پتہ چلا ہے کہ حکومت برطانیہ اپنے ناپاک قدم سرزمین پاک بطحا میں محکم تر کرنا چاہتے ہیں اور حجاز میں اسی بہانے سے ایک شفا خانہ بنانے کی تجویز پیش کر رہے ہیں تو اقبالؔ اس گستاخانہ حرکت کو برداشت نہیں کرتے وہ ''سر'' کا خطاب حاصل کر کے

ع۔انگریز کی دہلیز پر سر ہو گئے اقبالؔ ۔کی تہمت کو غلط ثابت کرتے ہیں اور اس تجویز کی سخت مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اوروں کو دیں حضورؐ یہ پیغام زندگی میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

جب ایک متعصب ہندو راج پال نے حضورؐ اکرم کی شان میں گستاخانہ کتاب'' رنگیلا رسولؐ ''نشر کی اور اس کتاب کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں میں غم اور غصّہ کی لہر دوڑی لیکن حکومت برطانیہ نے راج پال ہی کا ساتھ دیا اُس وقت ایک نوجوان علم الدین نے راج پال کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس قتل کے اقرار پر حکومت برطانیہ نے علم الدین کو پھانسی پر چڑھا کر ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید کر دیا۔ جب راج پال کے قتل کی اطلاع اقبالؔ کو ہوئی تو علامہ نے فرمایا ''ہم پڑھے لکھوں سے تو وہ ان پڑھ ترکھان (بڑھئی) کا لڑکا کہیں زیادہ عقلمند نکلا۔ہم بحثوں میں الجھتے رہے وہ کامیاب ہو گیا''۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب شہید علم الدین کے جنازے کا جلوس جس میں ہزاروں افراد شامل تھے علامہ کے گھر کے سامنے سے گذرا تو علامہ اپنی شدید بیماری اور کمزوری کے باوجود اس جنازے کے استقبال کے لئے اپنے گھر کے دروازے پر چند احباب کے ساتھ منتظر تھے۔آپ نے اس بیماری کے عالم میں آگے بڑھ کر بڑی دور تک جنازے کو کاندھا دیا۔علامہ کا چہرا سرخ تھا اور ان کی آنکھوں سے اس شہید کی کامیابی پر خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔ یہ تھی علامہ کی حضورؐ اور اُن سے محبت رکھنے والوں سے محبت۔علامہ خود فرماتے ہیں۔

اصل سنّت جز محبت ہیچ نیست علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست

یعنی خدا تک رسیدگی شریعت اسلام کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے اور شریعت سُنت محمدیؐ ہے اور اصل سنّت جز محبت وتولا کوئی اور چیز نہیں۔علامہ یہاں سورہ شوریٰ کی آیت ''قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی '' کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

علامہ اسرار خودی میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔''تمھارا محبوب کہیں باہر نہیں بلکہ تمھارے دلوں کے اندر ہی موجود ہے اور تمھاری عزت وآبرو اُسی کے نام سے قائم ہے۔

ہست معشوقی نہاں اندر دلت　　چشم اگر داری بیا بنمایت
در دل مسلم مقام مصطفیؐ است　　آبروی ما زنام مصطفیؐ است

یہ علامہ کے فنافی الرسولؐ ہونے کی دلیل تھی کہ وہ حضورؐ کا اسم گرامی لینا بھی گستاخی سمجھتے تھے اور اپنے نفس کو مزید پاکیزہ بنانا چاہتے تھے۔ اپنی مشہور مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' میں کہتے ہیں۔

چوں بنام مصطفیؐ خوانم درود　　از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے پابند غیر　　سینۂ تو از بتاں مانند دیر
چوں نداری از محمدؐ رنگ و بو　　از درود خود میا لا نام او

یعنی جب میں حضورؐ پر درود بھیجنا چاہا تو میں شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا کیوں کہ عشق نے آواز دی کے تو غیر سے محبت کرتا ہے اور تیرے دل میں حضورؐ کی پاکیزگی کا کوئی رنگ یا خوشبو نہیں چناں چہ حضورؐ کا اِسم عظیم اپنے ناپاک ہونٹوں سے نہ لے۔ ہم اس تحریر کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں جو عشقِ رحمت للعالمینؐ کا ماحصل ہے۔

مغز قرآں ' روح ایماں ' جان دین　　ہست حُب رحمتِ للعالمینؐ

علامہ اقبالؔ اور زیارت روضۂ رسولؐ

مشہور ہے کہ ایک دن علامہ اقبالؔ کے والد مرحوم نے اقبالؔ کی دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پوچھا اقبالؔ؟ تم ملکوں ملکوں پھرتے رہے لیکن روضۂ اطہر پر حاضری نہ دی۔ یہ سنتے ہی اقبالؔ کی حالت غیر ہوگئی، چہرہ سرخ ہوگیا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اسی اندرونی درد و کرب کی حالت میں بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ ''وہاں کس منہ سے جاتا''؟

ہمیں اس واقعہ سے اقبالؔ کی کسر نفسی کا پتہ چلتا ہے وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ حضورؐ کے آستانے پر حاضری دیں۔ انھیں شرم کا احساس تھا اور وہ اپنے نفس کا مزید تزکیہ کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ افسوس جب اقبالؔ اس تزکیہ نفس کی بدولت فنافی الرسولؐ کی منزل پر پہنچے تو بوڑھے اور بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے ان کی آنکھیں جواب دے چکیں تھیں لیکن اُس وقت بھی انھیں حضورؐ کے سامنے جانے سے شرمندگی تھی۔ آخری عمر کی وہ رباعی جو صوفی محمد رمضان کو بخش دی ان کے قلب کی صدائے برگشت ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روز محشر عذر ہائے من پذیر
در حسابم را نگیری نا گزیر از نگاہ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

(اے خدا تو دو عالم کا غنی ہے اور میں محتاج۔ حشر کے دن میرے گناہوں کو معاف کر دے اگر میرے صفحۂ اعمال دیکھنا لازمی ہو تو اُسے حضورؐ کی نظر سے بچا کر دیکھ لے)

علامہ اقبالؔ کی زندگی کے دقیق مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ کو زیارت روضۂ رسولؐ کی بے انتہا آرزو تھی۔ لسان العصر اکبرالہ آبادی کو ۶/ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارت روضۂ رسولؐ نصیب کرے۔ مدّت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھئے کب جوان ہوتی ہے''۔ افسوس صد افسوس کہ اقبالؔ کی یہ آرزو نا تمام رہی۔ ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شود۔ جب یہ آرزو جوان ہوئی تو اقبالؔ بوڑھے اور ناتوان ہو چکے تھے چناں چہ ان کے کلام سے پتہ چلتا

ہے کہ انھوں نے ''عالم خیال'' میں آستانہ نبوی کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔

جب نیاز الدین خان نے اقبالؔ کو خط کے ذریعہ زیارت روضۂ نبویؐ سے مشرف ہونے کی سعادت کا ذکر کیا تو اقبالؔ نے لکھا ''مبارک ہو۔ اس زمانے میں یہ بڑی سعادت ہے۔ قران کثرت سے پڑھنا چاہیے تا کہ قلب محمدیؐ سے نسبت پیدا ہو۔ میرا عقیدہ ہے کہ نبیؐ کریم زندہ ہیں۔ اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ کرام ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقاید کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا اس واسطے خاموش رہتا ہوں''

علامہ اقبالؔ کی روضۂ رسولؐ سے وابستگی اُس تحریر سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے ستمبر ۱۹۳۱ء کے خط میں گول میز کانفرس لندن جاتے ہوئے کشتی سے منشی طاہر الدین کے نام لکھی۔ لکھتے ہیں۔

''گول میز کانفرس کے ہندو اور مسلمان نمائندے شاید سات آٹھ ہیں۔ چار مسلمان نمائندے ہیں اور چاروں ''مغرب زدہ مسلمان''۔ سید علی امام کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے دیکھو بھائی اقبالؔ اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے گذر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور سے اُن کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی ان کی آنکھ نمناک ہوگئی اور بے اختیار ہو کر بولے۔ ع۔ بلغ سلامی روضۃ فیھا النبیؐ المحترم۔ ان کے قلب کی کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔''

اسی لئے تو علامہ نے فرمایا۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است اے خنک شہری کہ انجا دلبر است

اقبالؔ خاک مدینہ کو دنیا اور عقبیٰ پر اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ وہاں ان کے دلبر (محمدؐ) کا مزار مبارک ہے۔ کہتے ہیں کہ ''عالم خیال'' میں علامہ نے کئی بار آستانہ محمدیؐ پر حاضری دی لیکن ہر وقت کا انداز اور رنگ جدا رہا۔ کبھی کہتے ہیں۔

فرشتے بزم رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو حضور آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھ کو

علامہ کی آنکھیں کمزور ہو چکیں تھیں اور آخری عمر میں روضۂ اقدس کا شوق موجزن تھا اور اسی عالم خیال

میں کبھی سرمستانہ استغاثہ کرتے ہیں۔

تجلّی ریز بر چشم ام کہ بینی بایں پیری مرا تاب نظر ھست

میری آنکھوں پر نور چمکا کر دیکھ لے کہ ابھی بڈھاپے میں میری نظر میں نور کو برداشت کرنے کی طاقت ہے۔ کبھی دل کو یوں اطمینان خاطر دیتے ہیں۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتم نوا خواں از سرور عاشقانہ

چوں آں مرغی کہ در صحرا سرشام کشادے پر بہ فکر آشیانہ

یعنی میں نے بڑھاپے میں راہ مدینہ اختیار کیا ہے جو عشق کے نغموں کے ساتھ ہوگا میری مثال اُس پرندہ کی ہے جو سرشام صحرا میں اپنے آشیانہ جانے کے لئے پروں کو کھولتا ہے اور پرواز کرتا ہے۔

اقبالؔ کبھی عشق میں سرمست ہو کر کہتے ہیں۔

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست سوئے شہری کہ بطحا در رہ اوست

تو باش ایں جا و بہ خاصاں بیا میز کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یعنی بدن تو رہ گیا لیکن روح مدینہ کے سفر پر نکل گئی۔ تو یہاں پر خاص لوگوں سے ملتا رہ مجھے تو اب اپنے دوست (حضور اکرمؐ) کے گھر جانا ہے۔

مولانا غلام بھیک نیرنگ لکھتے ہیں کہ ''اقبالؔ کا قلبی تعلق حضورؐ سرور کائنات کی ذات اقدس سے اسقدر نازک تھا کہ حضورؐ کا ذکر آتے ہی ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی چونکہ میں بارہا ان کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا اس لئے میں نے ان کے سامنے تو نہیں کہا مگر خاص لوگوں میں بطور راز ضرور کہا کہ اگر یہ حضورؐ کے مرقد پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے بلکہ وہیں جان بحق ہو جائیں گے۔''

قصیدہ بردہ ۔ بوصیری اور علامہ اقبالؔ

تاریخ نعت میں دو نعتیہ قصیدے ' اور تین نعت گو شاعر مشہور ہوئے ہیں جن کو حضورؐ اکرم سے خاص نسبت حاصل رہی ہے۔ قصیدہ ''بانت سعاد'' جس کو قصیدہ بردہ یعنی قصیدہ چادر بھی کہتے ہیں جناب کعب بن زہیر کا ہے۔ جناب کعب بن زہیر زمانہ جاہلیت کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے تھے جنھوں نے پہلے پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخانہ اور توہین آمیز اشعار کہے لیکن بعد میں اپنے کئے پر نادم ہو کر رحمت العالمینؐ سے معافی طلب کر کے حضورؐ کی شان میں نعتیہ قصیدہ بانت سعاد پڑھا جس کے ایک شعر پر حضورؐ نے اصلاح کرتے ہوئے کعب کو اپنی ردائے مبارک عطا کی جس سے اُن کا لقب شاعرِ چادر رحمت ہو گیا۔ یہ ردا آج بھی ترکی میں (TOPKOPI) میں محفوظ ہے۔ ایک شعر میں جو حضورؐ نے تصحیح فرمائی وہ ''سیف الھند'' کی جگہ ''سیف اللہ'' ہے۔ یعنی رسولؐ خدا ھند کی تلوار نہیں بلکہ خدا کی تلواروں میں سے ایک چمکدار اور آبدار تلوار ہیں جن سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دوسرا مشہور ''قصیدہ الکواکب السعدیہ فی مدح خیر البریہ'' یا قصیدہ میمیہ ہے جو قصیدہ بردہ شریف کے نام سے مشہور ہے جسے شرف الدین ابوعبداللہ محمدؐ بن سعید بوصیری نے لکھا ہے۔

علامہ بوصیری ۶۰۸ ھجری میں مصر کے ایک گاؤں بوصیر میں پیدا ہوئے اور (۸۸) سال کی عمر بسر کر کے ۶۹۶ ھجری میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ یہ قصیدہ بردہ ' قصیدہ بانت سعاد کے تقریباً (۶۵۰) سال بعد لکھا گیا ہے۔ مختلف مستند حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بوصیری فالج کے حملہ سے مفلوج ہو چکے تھے چنانچہ برص اور جذام کی بیماری کی روایت ضعیف ہے۔ جب فالج کا کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا تو بوصیری نے حضورؐ اکرمؐ کی بارگاہ میں قصیدہ لکھا۔ اُسی رات خواب میں حضورؐ اکرمؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضورؐ کو یہ قصیدہ سُنایا۔ حضورؐ نے خوش ہو کر آپ کے بدن پر اپنا دست مبارک پھیرا اور بوصیری پر اپنی چادر اوڑھائی۔ جب آنکھ کھلی تو بوصیری مکمل صحت یاب تھے۔ صبح کو بغیر سہارے کے چلتا ہوا دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوا۔ راستے میں قطب زماں شیخ ابوالرجا ملے انھوں نے علامہ بوصیری سے قصیدہ کا مطلع پڑھ کر وہی قصیدہ سُنانے کی درخواست کی جو انھوں نے حضورؐ اکرمؐ

کو گذشتہ شب عالم خواب میں سنایا تھا۔ تمام لوگ یہ سن کر حیرت میں پڑ گئے کیونکہ بوصیری نے اس قصیدہ کو ابھی تک لوگوں کو نہیں سُنایا تھا اور نہ اس واقعہ کو بیان کیا تھا۔ اُس وقت سے یہ قصیدہ حضورؐ کی عطا کی گئی چادر کی نسبت سے قصیدہ بردہ ہی کہلاتا ہے۔ یہ قصیدہ (۱۶۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ رفع ودفع بلا اور حلاّلِ المشکلات مانا جاتا ہے اس میں حضورؐ کے فضائل خصائل شمائل مناقب معجزات اور ولائے محمدیؐ کے مضامین بھرے پڑے ہیں اس موقع پر اس بات کا انکشاف بھی بے محل نہیں کہ سب سے عظیم نعت گو شاعر جنھیں حضورؐ نے منبر پر بٹھا کر نعت سنی حسانؓ بن ثابت ہیں جنہیں شاعر دربار رسالت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے ان کے متعلق گفتگو اور ان کے نعتیہ کلام پر تاریخ نعت گوئی میں کافی ذخیرے موجود ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے اپنے فارسی کلام میں کعب بن زھیر کا ایک بار اور علامہ بوصیری کا دو بار تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے خطوط میں اسکا ذکر بھی کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضورؐ نے ان دو شاعروں یعنی کعب بن زھیر کو اپنی زندگی میں تمام اصحاب کے سامنے اور علامہ بوصیری کو حالت خواب میں کئی صدیوں کے گذر جانے کے بعد چادر رحمت عطا کر کے روحی اور بدنی بیماریوں سے نجات دے کر وہ مقام عطا کیا جو آج تک کسی کو حاصل نہیں چنانچہ شاید اِسی لیے علامہ اقبالؔ نے بھی ان افراد کا حوالہ دیتے ہوئے حضورؐ سے شفایابی کی دعا کی ہوگی۔

رموز بے خودی کی (۳۸) اشعار پر مشتمل مثنوی بعنوان ملّت محمدیہ توحید اور رسالتؐ ہے کے ذیل میں علاّمہ کعب بن زھیر کے قصیدہ انت سعاد کی بابت لکھتے ہیں۔

پیش پیغمبرؐ چو کعب پاک زاد　　ھدیہ ئی آورد از بانت سُعاد
در ثنائیش گوھر شب تاب سفت　　سیف ملول از سیوف الھند گفت
گفت سیف من سیوف اللہ گو　　حق پرستی جز براہ حق مپو

(ترجمہ) کعب پاک ذات نے حضورؐ کی خدمت میں قصیدہ بانت سعاد کا تحفہ پیش کیا جو آپ کی ثنا میں موتیوں کے ہار کی مانند درخشاں تھا جس میں حضورؐ کو ھند کی شمشیر بتلایا۔ حضورؐ اکرمؐ نے فرمایا کہ

مجھے سیف خدا کہو اور ہمیشہ حق کی پرستش کرو اور غیر از حق کسی دوسری راہ پر قدم مت بڑھاؤ۔

جہاں تک جناب بوصیری کے تذکرے کا تعلق ہے علامہ اقبالؔ نے دو بار ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک بار ۱۹۱۸ء کے رموز بیخودی میں بعنوان "عرض حال مصنف بحضورؐ رحمت العالمینؐ" ہے دوسرا ذکر ۳/اپریل ۱۹۳۶ء کو بھوپال میں سر سید احمد خان کہ خواب میں دیکھنے کے بعد اور سر سید کی تاکید پر اپنی بیماری کے لئے حضورؐ کی شفا طلب کرنے کی ہدایت پر ملتا ہے۔

رموز بے خودی میں (۶۵) اشعار کی مثنوی کے ۲۴ ویں شعر میں فرمایا

ای بصیری را ردا بخشندہ ئی　　بربط سلما مرا بخشندہ ئی

ذوق حق دہ این خطا اندیش را　　اینکہ نشناسد متاع خویش را

(ترجمہ) اے بصیری کو چادر بخشنے والے مجھے بھی بربط سلما عطا کر۔ جستجوئے حق کا شوق اس خطا کار کو دے جو اپنی متاع کو ابھی تک نہیں پہچانتا ہے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیان کے مطابق علامہ جوانی ہی سے ضعیفی چشم اور دوسری بدنی کسالتوں سے دوچار تھے مگر کلیوی اور حلق وگلو کی بیماریاں ان کی زندگی کے آخری آٹھ سالوں میں شدت سے ظاہر ہونے لگیں تھی۔ اِس مثنوی میں علامہ نے اپنی بدنی شفا کا ذکر نہیں کیا بلکہ اپنی روح کی تقویت اور پاکیزگی کی دعا کی ہے۔ اسی مثنوی میں مسلمانوں کی شکستہ حالی اور ان کی گرتی ہوئی روحانی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مسلم از سر نبیؐ بیگانہ شد　　باز این بیت الحرم بت خانہ شد

شیخ ما از برہمن کافر تر است　　زانکہ او را سومنات اندر سر است

یعنی مسلمان اسرار نبیؐ سے بیگانہ ہو گئے ہیں اور پھر کعبہ بت خانہ بن گیا ہے۔ ہمارا شیخ برہمن سے بھی بڑا کافر ہے کیونکہ سومنات ہمارے شیخ کے سر کے اندر ہے جبکہ برہمن کا سومنات اُس کے بدن سے باہر ہے۔

علامہ اقبالؔ نے اپنے خط ۲۹/جون ۱۹۳۶ء میں سر راس مسعود کو لکھا کی ۳/اپریل ۱۹۳۶ء جب میں بھوپال میں تھا آپ کے جد سر سید احمد خان کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہہ رہے تھے اپنی بیماری کو

حضورؐ کی خدمت میں عرض کرو چنانچہ جیسے ہی خواب سے بیدار ہوا میں نے چند اشعار زبان فارسی میں لکھے اور اب لاہور پہنچا تو اُس کو ایک مثنوی کی شکل میں ترتیب دے کر اس کا نام ''پس چہ باید کرد ای اقوام شرق'' رکھا ہے (مکتوبات اقبال۔ بھوپال صفحہ ۶۵۔ اخلاق اثر) اس مثنوی کے آخری (۶۲) اشعار بعنوان ''در حضورؐ رسالت مآب'' میں پانچ اشعار اقبال اپنی بیماری اور دوا خوری کے بارے لکھتے ہیں اور حضورؐ سے بوصیری کا واسطہ دے کر شفا طلب کرتے ہیں۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کی بیماری کے عنوان کے ذیل میں لکھا کہ علامہ چھوٹے بچوں کی طرح کڑوی اور تلخ دواؤں سے گھبراتے تھے اور انہیں استعمال نہیں کرتے تھے۔ اقبال فرماتے ہیں۔

کار این بیمار نتوان برد پیش　　من چو طفلان نالم از داروئ خویش
در نسازد با دوا ها جان زار　　تلخ و بویش برمشا میم ناگوار

اقبالؔ اور عشقِ علی علیہ سلام

کسی بھی شاعر کا کلام اُسکی فکر و تخیل، علم و دانش اور شعریت کا آئینہ ہوتا ہے یعنی شعر بڑی حد تک شاعر کی شخصیت کی تفسیر اور اُسکے جذبات کی تصویر ہوتا ہے۔ نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ اقبالؔ کے کلام میں عشقِ حضرت علی علیہ السلام کی قدروں کے مطالعہ سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ علامہ سچے اور حقیقی عاشق علی علیہ السلام تھے۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے قرآنی تفاسیر کے ساتھ ساتھ احادیث نبویؐ اور تاریخ اسلامی کا بہ تحقیق مطالعہ کیا اور انہی گراں قدر علوم کے ذریعہ راہِ حق دریافت کیا چنانچہ علامہ نے ابتدائی دینی تعلیم مولوی میر حسن صاحب سے حاصل کی جو آپکے عربی اور فارسی کے اُستاد بھی رہے پھر اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کیلیئے اسلامیات کے ساتھ ساتھ فارسی کے عظیم شعراء کے کلام سے مستفید ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں علامہ حضورؐ سرور مرتبت سے والہانہ محبت رکھتے تھے وہاں بے پناہ عشق حضرت علیؑ کی ذات سے بھی کرتے تھے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علیؑ نے نصرت و حفاظت اور محبت رسولؐ پر اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو قربان کر دیا تھا خود فرماتے ہیں۔

ہیچ کس رازی کہ من گویم نگفت ہمچو فکر من دُرِ معنی نہ سفت

(کسی نے بھی میری طرح گراں قدر راز و رموز بیان نہیں کئے اور نہ کسی فکر نے میری طرح معنوی موتی پروئے)

اس خصوصی تحریر میں تمام تر کوشش یہی کی گئی ہے کہ اقبالؔ اور عشقِ علیؑ کا موضوع اُنہی کے کلام کے ذریعہ روشن ہو سکے تا کہ قارئین پر یہ واضح ہو سکے کہ اقبالیات میں اسلام کا مرکز اور ایمان کا محور عشقِ محمدؐ اور عشقِ علیؑ ہی تھا۔

اگر چہ صدھا اشعار اُردو اور فارسی میں کلیاتِ اقبالؔ میں موجود ہیں لیکن مضمون کے عنوان اور اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف چند اشعار جو حضرت علیؑ کی ذات گرامی سے وابستہ ہیں پیش کئے گئے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے فارسی مثنوی اسرار خودی میں ایک (۵۹) اشعار کی نظم "حضرت علیؑ کے

ناموں کے اسرار کی تشریح'' کے عنوان کے تحت لکھ کر حضرت علیؑ کے بارہ سے زیادہ نام، کنیات خطابات اور القاب کی تشریح بڑے دلکش انداز میں کرتے ہوئے ملّتِ اسلامیہ کو دعوت فکر دیتے ہوئے فرمایا۔

ھر کہ دانائے رموز زندگی ست سرِّ اِسمائے علیؑ داند کہ چیست

(اُس شخص نے زندگی کے تمام رازوں کو پہچان لیا ہے جس نے حضرت علیؑ کے ناموں کے اسباب اور رازوں کو جان لیا ہے)

مسلم اوّل شہ مرداں علیؑ عشق را سرمایہ ایماں علیؑ

اس شعر میں علامہ نے حضرت علیؑ کی تین بڑی فضیلتیں جو دیگر مسلمانوں کو میسّر نہ ہوسکیں بیان کی ہیں۔ پہلی فضیلت حضرت علیؑ سب سے پہلے مسلمان تھے۔ابو حازم اور زین بن ارقم سے مروی ہے کہ ''علیؑ اول من اسلم''، یعنی علیؑ نے سب سے پہلے دعوت اسلام پر لبیک کہا۔حضرت علیؑ کی دوسری فضیلت وہ مردوں کے شاہ قرار پائے چنانچہ تاریخیں گواہ ہیں کہ بدر، احد، خندق، خیبر اور دیگر غزوات میں آپ ہی کی شجاعت نے اسلام کی لاج رکھ لی اور آپ ہی کی تلوار ذوالفقار ہی نے جو فلک سے آپ پر اُتری تھی دشمنان اسلام کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔تیسری فضیلت حضرت علیؑ کی محبت ہے جو ایمان کا اساس اور سرمایہ رہی کیونکہ آپ نے ہمیشہ حضورؐ اکرمؐ کے پسینۂ پر اپنا خون بہانا پسند کیا اور شب ہجرت بسترِ رسولؐ پر سو کر پیغمبرؐ کی جان بچائی اور اس طرح اپنا نفس خوشنودی خدا میں فروخت کر کے ہدایت خدا حاصل کی۔اس پر آپ فرماتے ہیں۔

مرسلؐ حق کرد نامش بو ترابؑ حق یدالہ خواند در اُمّ الکتاب

مرتضیٰؑ کز تیغ او حق روشن ست بو ترابؑ از فتح اقلیم تن است

حضرت رسولؐ کریمؐ نے علیؑ کو ابوتراب ''مٹی کا باپ'' کی کنیت سے سرفراز فرمایا۔حضرت علیؑ اس لئے بوترابؑ ہوئے کہ آپ اپنے سفالی بدن کی خواہشات، نفس امارہ پر مکمل قابو کر کے ''نفس مطمئنہ'' ہو گئے تھے۔علامہ فرماتے ہیں خداوندے عالم نے حضرت علیؑ کو سورہ الفتح میں ''یدالہ'' خدا کا ہاتھ قرار

دیا کیوں کہ آپ نے اپنی رضا اور مرضی کو رضائے خدا کے سپرد کر دیا تھا۔
آپ مرتضیٰ یعنی ''منتخب و پسندیدہ'' اس لئے ہیں کہ آپ کی تلوار اور آپ کے جہاد نے باطل کو مٹا کر حق کا بول بالا کیا۔

زیر پاش اینجاہ شکوہ خیبر است دستِ او آنجا قسیم کوثر است

(حضرت علیؑ نے دنیا میں فاتح خیبر ہونیکا شرف پایا تو دوسری طرف عرش پر کوثر کو تقسیم کرنے والے کی فضیلت سے ہمکنار ہوں گے)

ذات او دروازئ شہر علوم زیر فرمانش حجاز وچین وروم
مرد کشور گیر از کرارّی است گو ھرش را آبرو خود داری است

علامہ مشہور حدیث پیغمبرؐ ''انا مدینۃ علم وعلی بابھا'' یعنی میں شہر علم ہوں اور علیؑ اُسکا دروازہ ہیں، کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ حضرت علیؑ کے خطاب ''کرّار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کو اُس وقت تک کامیابی اور فتح حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ آور نہ ہو، جس طرح سے علیؑ نے علم حاصل کر کے قلعہ خیبر فتح کیا تھا۔ علامہ فرماتے ہیں ۔

ھر کہ در آفاق گردد بو ترابؑ باز گر داند ز مغرب آفتاب

(آپ کا معجزہ ردالشمس کا اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں جو شخص اس دنیا میں بوترابؑ ہونے کا لقب حاصل کرتا ہے وہی گردش آفتاب کو مغرب سے پلٹ سکتا ہے) علامہ اقبالؔ کو حضرت علیؑ سے بے پناہ محبت تھی اور اِسی عشق کو وہ اپنی کامیابی اور پیروزی کا راز سمجھتے تھے چنانچہ ایک غزل میں کہتے ہیں۔

یہ ہے اقبالؔ فیض یاد نام مرتضیٰؑ جس سے نگاہِ فکر بیں خلوت سرائے لا مکاں تک ہے

ایک اور موقع پر اسرار خودی میں یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔

از ولائے دود مانش زندہ ام درجھاں مثلِ گہر تابندہ ام

(یعنی حضرت علیؑ کے عالی خاندان کی الفت اور محبت سے زندہ ہوں اور اِسی محبت و الفت کے باعث سارے عالم میں میری شہرت کی روشنی ہے)

زمزم ار جو شد زخاک من از او ست　　مئے اگر ریزد زتاکِ من از او ست

(یعنی چونکہ حضرت علیؑ علم وحکمت ودانش کا سمندر ہیں اس لئے علامہ کی فکر سے ابلتے ہوئے چشمے اور چھلکتی ہوئی معرفت کی شراب کا منبع ذات مولا علیؑ ہی ہے) ایک اور مقام پر بانگ درا میں ''میں اور تو'' کے ذیل میں کہتے ہیں۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر وغنا نہ کر　　کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدریؑ

نہ ستیز گاہ جہان نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے　　وہی فطرت اسدؑ اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

ضرب کلیم میں ارشاد فرماتے ہیں۔

مرے لئے فقط زور حیدریؑ کافی　　ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

بے جرات رندانہ ہر عشق ہے روباہی　　بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید الٰہی

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی　　کہ اس کے فقر میں ہے حیدریؑ و کرّاری

پھر فرماتے ہیں۔

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل　　نہ زور حیدریؑ تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؑ

اسرار خودی میں کہتے ہیں۔

نعرۂ حیدرؑ نوائے بوذر است　　گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبر است

ایک اور مقام پر جاوید نامہ میں کہتے ہیں۔

پیش اُو نہ آسمان نہ خیبر است　　ضربت او از مقام حیدرؑ است

جاوید نامہ میں اجنبی تعلیم وتربیت کو غارت گری اور قوت حیدریؑ نہ ہونیکی وجھ سے دیر قلعہ خیبر کی شکل میں بدل گئے ہیں بتاتے ہیں ۔

دانش افرنگیاں غارت گری　　دیرہا خیبر شد از بی حیدریؑ

اعلیٰ حضرت ظاھر شاہ کی دعوت کا سفر کرتے ہوئے ''مسافر نامہ'' میں ارشاد کرتے ہیں۔

می شناسی معنیٔ کرارؑ چیست　　ایں مقامی از مقاماتِ علیؑ ست

مومناں را در زمانِ بی ثبات　　نیست ممکن جز بہ کراری حیات
مسلم ھندی چرا میداں گذاشت　　ھمت او بوی کراری نداشت

(یعنی جانتے ہو کرّار کے معنی کیا ہیں۔ یہ مقام فضیلت علیؑ کے فضائل کا ایک جز ہے۔ اس دار فانی کی اُمتیں بغیر کرّاری کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں سے میداں اس لئے چھوٹا کہ ان کی ہمت میں کراری کی خوبُو موجود نہ تھی۔)

کبھی بال جبرئیل میں عشق علیؑ میں مست ہو کر فرماتے ہیں۔

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق　　کبھی سوز و سرور انجمن عشق
کبھی سرمایہ محراب و منبر　　کبھی مولا علیؑ خیبر شکن عشق
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسدؑ اللّٰہی

جاوید نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

عشق بانانِ جویں خیبر کشاد　　عشق در اندام مہ چاکی نھاد

(یعنی یہ عشقِ الٰہی تھا جس کی قوت نے دروازہ خیبر اکھاڑا، جسکی غذا جو کی روٹی تھی اور جس کے اشارہ پر چاند کے بدن میں شگاف ہوا)۔ علامہ اقبال کی ایک خاص مناجات ''سپاس امیرؑ'' جسے وہ ہر روز بعد نماز فجر کے پڑھا کرتے تھے اور جو جنوری ۱۹۰۵ء میں مجلّہ مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اسکے (۳۴) اشعار میں سے صرف چند شعر پیش کئے جا رہے ہیں۔

اے باب مدینہ محبت　　اے نوحؑ سفینہ محبت
اے سرّ خط وجوب امکان　　تفسیر تو سورہائے قرآن
اے سرِّ نبوّت محمدؐ　　اے وصف تو مدحت محمدؐ
بے تو نتواں با او رسیدن　　بے او نتواں بتو رسیدن
از ہوش شدم مگر بہ ہوشم　　گوئی کہ نصیرئی خموشم
امّا چہ کنم مئے تولّا　　تُند است بروں فتد زمینا

زاندیشہ عاقبت رھیدم جنس غم آل تو خریدم

(اے شہر محبت کے دروازے، اے محبت کے سفینہ کے ناخدا، اے معبود اور عبد کے درمیانی رشتے اے قرآنی سورتوں کی تفسیر، اے راز دار نبوت محمدؐ جسکی روح، روح محمدؐ ہے۔ تیرے بغیر (علیؑ) محمدؐ تک نہیں جاسکتے اور اُسکے (محمدؐ) کے بغیر (علیؑ) تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں ہوش کی زیادتی سے بیہوش ہو گیا ہوں، یعنی یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک خاموش نصیری کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ کیا کروں کہ تیری محبت کی شراب اتنی تیز اور دو آتشہ ہے کہ میرے دل کی صراحی سے چھلک چھلک کر گر رہی ہے۔ مجھے اب آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ میں نے تیری (علیؑ) اولاد کی محبت اور اُن کی اطاعت کو آخرت کا اثاثہ سمجھ کر خرید رکھا ہے)۔

مسلمانوں کے حق میں دعا کرتے ہوئے بال جبرئیل میں ارشاد فرماتے ہیں۔

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے اُسے بازوی حیدرؑ بھی عطا کر
بڑھ کر خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن اِس زمانے میں کوئی حیدرؑ کرّار بھی ہے

آخر میں نمونہ کے طور پر صرف چند اشعار جو علامہ اقبالؔ کے خصوصی عشق علیؑ کا سراغ دیتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

فیض اقبالؔ ہے اُسی در کا بندۂ شاہِ لافتیٰؑ ہوں میں (فریاد امت)
کرم کرم کہ غریب دیار ہے اقبالؔ مریدِ پیر نجفؑ ہے غلام ہے تیرا (التجائے مسافر)
دل میں ہے مجھ بے عمل کہ داغِ عشق اہلبیتؑ ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِ دامنِ حیدرؑ مجھے
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

منقبت حضرت فاطمہؑ ۔ اقبالؔ کی قلبی واردات۔

علامہ اقبالؔ نے ۱۹۱۷ء میں رموز بے خودی میں فاطمہ زہراؑ تمام مسلمان عورتوں کے لیے اُسوہ کاملہ ہیں کے عنوان کے تحت ایک (۱۹) اشعار کی منقبت لکھی جو ایک شاہکار تخلیق تصوّر کی جاتی ہے۔ علامہ بڑی دیدہ ریزی اور مشکل پسندی سے اہلبیت کرامؑ کی مدح کرتے تھے اور ان موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت دوسرے اساتذہ سخن کے مشوروں اور رہنمایوں سے بہرہ مند بھی ہوتے تھے۔ اس چھوٹی سی (۱۹) اشعار کی نظم پر علامہ نے چھ ہفتوں سے زیادہ فکر و غور کیا۔ علامہ کے پانچ خطوط مولانا گرامؔی کے نام اس مضمون پر ہیں جو ہمارے بیان کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

مولانا عبدالقادر گرامؔی جالندھری سے علامہ اقبالؔ کے تعلقات ۱۹۰۲ء سے برقرار تھے وہ ۱۹۱۷ء تک حیدرآباد دکن کے شاہی دربار سے منسلک رہے اور ملک الشعرا قرار پائے۔ آخری عمر میں ہوشیار پور آ گئے جہاں ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ محمد عبدالقریشی نے مکاتب اقبالؔ بنام گرامؔی کے عنوان سے اُن کے (۹۰) خطوط شائع کئے ہیں۔

علامہ اقبالؔ ۱۸ جون ۱۹۱۷ کو مولانا گرامؔی کے خط میں لکھتے ہیں کہ آج کل فاطمہ زہراؑ کا مضمون زیر نظر ہے۔ دو شعر لکھے تھے جو ذیل میں عرض کرتا ہوں۔ بہ نظر اصلاح اور رائے سے آگاہ کیجئے۔

بہر محتاجی دلش آنگونہ سوخت　　با بھودی چادر خود را فروخت

محت ش پر ور دۂ صبر و رضا　　آسیا گردان و لب قرآن سرا

دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ کھٹکتا ہے۔

چونکہ مولانا گرامؔی کے خطوط جو اُنھوں نے اقبالؔ کو لکھے ہمارے دسترس سے خارج ہیں اور ہمارے درمیان موجود نہیں اس لئے ہم صرف قیاس کر سکتے ہیں کہ دوسرے شعر کا پہلا لفظ محتش کو گرامؔی نے ''آن ادب'' کر دیا ہوگا کیوں کہ نظم میں اب شعر یوں ہے۔

آن ادب پروردۂ صبر و رضا　　آسیا گردان و لب قرآن سرا

(یعنی وہ ادب، صبر اور رضا کی آغوش کی پلی تھی جو چکی پیستے وقت بھی قرآن کی تلاوت میں مشغول

رہتی تھی)۔ علامہ یکم جولائی ۱۹۱۷ء کے خط میں مولانا گرامی کو لکھتے ہیں البتہ مریم کو فاطمہ زہراؑ کے متعلق ایک نسبت حاصل تھی یہ کہ وہ مسیح کی ماں تھی لیکن فاطمہؑ تین نسبتوں سے محترم ہیں ۔

مریمؑ از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز — از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز
نور چشم رحمت العالمینؐ — آن امام اولین وآخرین
آنکہ جان در پیکر گیتی دمید — روزگار تازہ آئین آفرید
بانوی آن تاجدار ھل اتی — مرتضیٰؑ مشکل گشاؑ شیر خداؑ
پادشاہ و کلبۂ ایوان او — یک حسام ویک زِرہ سامان او
مادر آں کارواں سالار عشق — رونق ہنگامہ بازار عشق (یہ مصرع کھٹکتا ہے)

(ترجمہ ''اگر مریم کی نسبت مادر عیسیٰؑ ہونیکی وجہ سے محترم ہے تو حضرت فاطمہؑ تین نسبتوں سے محترم ہیں۔ فاطمہؑ رحمت للعالمینؐ کی نور چشمی ہیں جو اولین اور آخرین امام ہیں۔ جن کی بدولت دنیا بنی اور خلق کی گئی۔ فاطمہؑ اُن کی ہمسر ہے جن کے سر پر ھل اتی کا تاج ہے جو مرتضیٰؑ مشکل کشا اور شیرؑ خدا ہے جو ایسا بادشاہ تھا کہ اس کا چھوٹا سا گھر اسکا ایوان تھا اور ایک تلوار اور ذرہ اس کا سامان تھا۔ فاطمہؑ عشق کے کارواں کے سالار کی ماں ہے جو بازار عشق کے ہنگامے کی رونق تھا۔)

علامہ اقبالؔ کے خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کی گرامیؔ نے بتایا کہ دونوں مصرعوں میں آخری شعر کے ''مادر'' آنا چاہیے چنانچہ اقبالؔ نے آخری شعر یوں کر دیا ۔

مادر آن مرکز پرکار عشق — مادر آں کارواں سالار عشق

علامہ اقبالؔ اپنے تیسرے خط بنام مولانا گرامیؔ ۳ جولائی ۱۹۱۷ء میں لکھتے ہیں ''میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ میں فکر میں ہوں کہ حضرت سیّدہ کے متعلق ایک ایسا شعر لکھا جائے جو معنی کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو۔ آج صبح آنکھ کھلتے ہی وہ شعر ذہن میں آیا ابھی اسے خراد کی ضرورت ہے۔ عرض کرتا ہوں۔

گریۂ شب ہائے آن بالا نشین — ہم چو شبنم ریخت بر عرش برین

اس شعر کو بہ نظر غور ملاحظہ فرمائے۔ ''بالانشین'' ''ریختن'' کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے مگر کسی قدر کھٹکتا ہے''۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا گرامی کے مشورے سے اقبال نے اس موضوع کو دو شعروں میں بیان کیا اور پہلے مصرع میں بھی تبدیلی کی۔

گریہ ھائی او زبالین بے نیاز　　گوھر افشاندی بدامان نماز
اشک او بر چید جبریلؑ از زمین　　ھمچو شبنم ریخت بر عرش برین

ترجمہ۔ اُس کے بے نیاز گریہ میں جو آنسو گوہر کی طرح نماز کی حالت میں اُس کے دامن اور زمین پر گرتے رہے اُسے جبریل نے چنا اور شبنم کے مانند عرش بریں پر بکھیر دیئے۔

علامہ اقبال پھر ۶ جولائی کو مولانا گرامی کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''آپ نے جو ترمیم کی وہ بہت بلند ہے بہر حال میں اسے سمجھتا ہوں اور چوں کہ آپ نے پیدا کیا ہے اس کی داد دیتا ہوں۔ چونکہ فاطمہؑ کے متعلق اشعار نظم کر رہا ہوں کیا آپ کو کوئی عمدہ روایت اُن کی طاعت گذاری یا تربیت اولاد کے متعلق یاد ہے جس کو نظم کیا جائے۔ معنی خیز گداز روایت ہو تو نظم کرنے میں لطف آتا ہے''۔

علامہ اقبال کا آخری خط اِس ذیل میں ۱۶ جولائی ۱۹۱۷ کا ہے جس میں مولانا گرامی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ ''ھاں فاطمہؑ کے متعلق جو اشعار میں نے لکھے تھے اُس کے آخر کے اشعار اس طرح سے ہیں۔

مادر آن مرکز پرگار عشق　　مادر آں کاروان سالار عشق
آں یکی شمع شبستان حرم　　حافظ جمعیت خیر الاممؐ
تا نشیند آتش پیکار وکین　　پشت پا زد برسر تاج و نگین
در نوای زندگی سوز از حسینؑ　　اھل حق حریت آموز از حسینؑ
سیرت فرزندھا از امہات　　جوھر صدق و صفا از امہات
مزرع تسلیم را حاصل بتولؑ　　مادران را اسوہ ای کامل بتولؑ

(ترجمہ ۔ فاطمہؑ مرکز پرگار عشق اور کاروان سالار عشق کی ماں ہے۔ ایک بیٹا حرم کے شبستان کی شمع

جمعیت خیر الامم کا محافظ جس نے تخت و تاج کو ٹھوکر پر مارا۔ زندگی کے نغمہ میں سوز و گداز حسینؑ سے ہے اھل حق کے لئے حسینؑ درس آزادی ہے۔ اولاد کی سیرت نگاری اور اُن کی صدق و صفا کے جوہر کی نشونما ماں سے ہے۔ اسلام کی کشت کا ثمر فاطمہؑ ہے اور فاطمہؑ کی زندگی مادران کے لئے اسوہ کامل اور اسوہ حسنہ ہے)

اقبالؔ ۱۶/ جولائی ۱۹۱۷ کے خط میں ان اشعار کو لکھنے کے بعد کہتے ہیں ''آپ نے لکھا تھا کہ دونوں مصرعوں میں ''مادر'' کا لفظ ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کیا نکتہ تھا جس کے بیان کرنے کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس اشارے سے فایدہ اٹھایا ہے کہ بعد کے شعر میں حسنؑ و حسینؑ دونوں کا ذکر کر دیا ہے۔ اب ان اشعار کے بعد کا مضمون یہ ہے کہ ایسے بیٹوں سے جن کے یہ اوصاف ہیں ماں کی تربیت کا اندازہ کرنا چاہئے تا کہ معلوم ہو کہ اس ماں کی آغوش میں کیا تاثیر تھی جس میں ایسے بچوں کی پرورش ہوئی''۔

علامہ اقبالؔ نے اس نظم کو ان آخری دو اشعار پر ختم کیا۔

رشتہ ئی آئین حق زنجیر پاست　　پاس فرمان جناب مصطفیؐ است
ورنہ گرد تربتش گردید مے　　سجدہ ھا بر خاک او پا شید مے

یعنی اسلام کے آئین کی زنجیر میرے پاؤں میں ہے اور شریعت محمدیؐ کا خیال بھی ہے ورنہ میں فاطمہؑ کی قبر کے طواف میں زندگی بسر کر دیتا اور اُن کی قبر پر تمام عمر سجدے نچھاور کرتا رہتا۔